ریاستِ خلافت

کی حکومتی اور انتظامی تنظیم

حزب التحریر

پہلا ایڈیشن: 1426ھ - 2005ء

اردو ایڈیشن: 2009ء

فہرست

پیش لفظ 7

تمہید 11

ریاستِ خلافت کی حکومتی اور انتظامی تنظیم 24

پہلا: خلیفہ 24

لقب 25

خلیفہ کی شرائط 26

انعقاد کی شرائط 27

ترجیحی شرائط 31

خلیفہ کے تقرر کا طریقہ 32

خلیفہ کے تقرر کی عملی کاروائی اور خلیفہ کی بیعت 34

عبوری امیر 37

نامزدگان کی تعداد کی حد بندی 39

بیعت کی کیفیت 45

وحدتِ خلافت 46

خلیفہ کے اختیارات 49

خلیفہ قوانین کی تبنی میں احکاماتِ شریعہ کا پابند ہوتا ہے 57

ریاستِ خلافت ایک انسانی ریاست ہوتی ہے نہ کہ ریاستِ الٰہیہ 60
خلیفہ کی امارت کی معیاد 63
خلیفہ کی معزولی 64
خلیفہ کے تقرر کے لیے مسلمانوں کو دی گئی مدت 65
دوسرا: معاونین (وزرائے تفویض) 68
معاونِ تفویض کی شرائط 72
معاونِ تفویض کی ذمہ داری 74
معاونین کا تقرر اور ان کی برطرفی 77
تیسرا: وزرائے تنفیذ 79
چوتھا: والی 90
خلیفہ پر لازم ہے کہ وہ والیوں کے کام کی جانچ پڑتال کرے 94
الجہاد 97
اول: فوج 98
دوم: داخلی امن 99
سوم: صنعت 101
چہارم: بین الاقوامی تعلقات 104
پانچواں: امیرِ جہاد - شعبۂ حرب (فوج) 106
خلیفہ ہی فوج کا قائد ہوتا ہے 113
چھٹا: داخلی امن 116

شعبۂ داخلی امن کی ذمہ داریاں 118

ساتواں: شعبۂ خارجہ 129

آٹھواں: صنعت 131

نواں: عدلیہ 134

قاضیوں کی اقسام 137

قاضیوں کے تقرر کی شرائط 140

قاضیوں کی تقرری 141

قاضیوں کی تنخواہیں 141

عدالتوں کی تشکیل 143

محتسب 147

محتسب کے اختیارات 148

قاضی مظالم 149

قاضی مظالم کا تقرر اور معزولی 152

محکمۂ مظالم کے اختیارات 154

قیامِ خلافت سے قبل کے معاہدے، معاملات اور فیصلے 155

دسواں: عوامی بہبود کے انتظامی محکمہ جات 160

عوامی بہبود کا محکمہ جاتی ڈھانچہ انتظامی اسلوب ہے اور یہ حکمرانی کرنا نہیں ہے 164

انتظامی معاملات کی پالیسی 167

ریاستی انتظامیہ میں ملازمت کے مستحق لوگ: 167

گیارہواں: بیت المال 169

بارہواں: شعبۂ ابلاغ 180

ذرائع ابلاغ کیلئے اجازت نامہ یا لائسنس 184

ریاست کی میڈیا پالیسی 184

تیرہواں: مجلسِ امت: شوریٰ ومحاسبہ 185

شوریٰ کا حق 186

فریضۂ محاسبہ 187

مجلسِ امت کے ممبران کا انتخاب 190

مجلسِ امت کے ممبران کے انتخاب کی کیفیت 191

مجلسِ امت کی رکنیت 193

مجلسِ اُمت کی رکنیت کی میعاد 195

مجلسِ اُمت کے اختیارات 195

اظہارِ رائے اور گفتار کا حق 208

پرچم اور جھنڈے 212

ریاستِ خلافت کا ترانہ 217

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

الحمد للّٰہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللّٰہ و علی آلہ وصحبہ ومن والاہ وبعد،

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾

''اللہ نے اُن لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور انہوں نے نیک اعمال اختیار کئے ہیں، وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں زمین میں لازماً حکمرانی عطا کرے گا، جیسا کہ اُس نے اُن کو حکمرانی عطا کی تھی جو ان سے قبل تھے، اور اُن کیلئے لازماً ان کے اِس دین کو محکم کر کے جما دے گا، جسے اس نے ان کیلئے پسند کیا ہے، اور ضرور ان کی خوف کی حالت کو امن و بے خوفی سے بدل دے گا۔ وہ میری بندگی کریں گے، اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کریں گے، اور جو کوئی اس کے بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں'' (النور:55)

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((تكون النبوة فيكم ما شاء اللّٰه أن تكون،ثم يرفعها إذا شاء أن يرفعها، ثم تكون خلافةً على منهاج النبوة فتكون ما شاء اللّٰه أن تكون، ثم يرفعها. إذا شاء أن يرفعها. ثم تكون ملكاً عاضاً، فيكون ما شاء اللّٰه أن تكون، ثم يرفعها. إذا شاء أن يرفعها، ثم تكون ملكاً جبريةً فتكون ما شاء اللّٰه أن تكون، ثم يرفعها إذا شاء أن يرفعها،ثم تكون خلافةً على منهاج النبوة،ثم سكت)).

''تم میں اُس وقت تک نبوت رہے گی جب تک اللہ چاہے گا کہ نبوت رہے، پھر اللہ جب چاہے گا اسے اُٹھالے گا، پھر نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت ہوگی، تو وہ باقی رہے گی جب تک اللہ چاہے گا، پھر وہ جب چاہے گا اسے اُٹھالے گا، پھر موروثی حکمرانی کا دور ہوگا، تو وہ رہے گی جب تک اللہ چاہے گا، پھر وہ جب چاہے گا اسے اُٹھالے گا، پھر جبری اور استبدادی حکومت ہوگی، تو وہ باقی رہے گی جب تک اللہ چاہے گا، پھر وہ اسے اُٹھالے گا جب وہ چاہے گا، پھر نبوت کے نقشِ قدم پر (دوبارہ) خلافت ہوگی۔ پھر آپ ﷺ خاموش ہوگئے'' (مسند احمد)

حزب التحریر کو اللہ تعالیٰ کے وعدے پر ایمان ہے اور ہم رسول اللہ ﷺ کی بشارت کی تصدیق کرتے ہیں اور ہم امتِ مسلمہ کے ساتھ مل کر اور امت مسلمہ کے درمیان اس کام میں سرگرمِ عمل ہیں کہ خلافت کو دوبارہ قائم کیا جائے اور اس بات پر ہمیں مکمل اطمینان ہے کہ خلافت ضرور دوبارہ قائم ہوگی۔ ہم اللہ سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں خلافت کے قیام سے نوازے اور ہم اس خلافت کے سپاہی ہوں، اُس کے پرچم کو خیر کیلئے بلند کریں اور اسے ایک کامیابی سے دوسری کامرانی کی جانب رواں کریں۔ اور یہ سب کچھ اللہ کیلئے کچھ بھی مشکل نہیں۔

اس کتاب کے ذریعے ہماری خواہش ہے کہ ریاستِ خلافت میں مختلف حکومتی و انتظامی اداروں اور محکموں کو واضح شکل میں بیان کر دیا جائے، جو نہ صرف آسان فہم اور عملی نفاذ کے لحاظ سے

واضح ہوں بلکہ اُس سے قبل وہ اپنے استدلال اور استنباط کے اعتبار سے صحیح ہوں تا کہ وہ دل میں اتر جائیں اور قلب اِن پر مطمئن ہو جائے۔

اس جانب توجہ کیلئے جو چیز ہمارے لئے محرک بنی وہ دنیا میں موجود حکومتی نظاموں کا اسلامی نظامِ حکومت سے اپنی شکل اور ترکیب کے لحاظ سے بعید ہونا ہے۔ جہاں تک ان نظاموں کی ترکیب کا اسلامی نظامِ حکومت سے مختلف ہونے کی بات ہے تو یہ مسلمانوں پر واضح ہے کہ موجودہ تمام کے تمام نظام اللہ ﷻ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت سے اختیار نہیں کیے گئے اور نہ ہی یہ نظام اللہ کی کتاب اور سنتِ رسول سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں، بلکہ یہ نظام اسلامی نظام سے ٹکراتے ہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے مسلمان محسوس کرتے ہیں اور اس حقیقت پر کوئی اختلاف نہیں۔

لیکن جس بات میں مسلمانوں کے فہم میں قدرے التباس ہے وہ اُن کا یہ خیال ہے کہ اسلامی حکومت اور موجودہ نظام اداروں اور ڈھانچوں کے لحاظ سے باہم مختلف نہیں ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو نظامِ حکومت میں وزارتی کابینہ، وزراء اور وزارات وغیرہ کے ہونے اور اُن کے وہی اختیارات اور ہیئت ہونے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ پس اس کتاب کے ذریعہ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ ریاستِ خلافت میں حکومتی اداروں اور محکمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے تا کہ قبل یہ کہ ہم اللہ کے حکم سے ریاستِ خلافت کو بالفعل اپنی آنکھوں سے دیکھیں، اُس کی شکل اور ادارے ہمارے ذہنوں میں مکمل شفافیت سے واضح ہو جائیں۔

نیز اس کتاب میں ریاستِ خلافت کے پرچم اور جھنڈے پر بھی ضمیمہ شامل ہے۔ جبکہ بعض امور کو اس کتاب میں شامل نہیں کیا گیا، انہیں وقت آنے پر بیان کر دیا جائے گا۔ اور اس وقت انشاء اللہ اُن کے قوانین اس کتاب کے ضمیمہ کی شکل میں بیان کر دیے جائیں گے، اِن میں سے بعض موضوعات یہ ہیں:

خلیفہ کے انتخاب کا طریقہ اور اُس کی بیعت کی کیفیت؛ کسی ایسے ممکنہ وقتی امیر کے

اختیارات جسے خلیفہ کے یرغمال بنا لئے جانے کی صورت میں عارضی طور پر امیر بنایا جائے، خواہ اُس وقت خلیفہ کے یرغمالی سے چھوٹ جانے کا امکان ہو یا نہ ہو؛ صوبائی پولیس کی نفاذ اور انتظامیہ کے اعتبار سے تنظیم؛ داخلی امن کے شعبے میں خواتین پولیس کی تعیناتی؛ صوبائی مجلس اور مرکزی مجلسِ شوریٰ کے انتخاب کی کیفیت؛ ریاستی ترانے کا انتخاب۔ ان موضاعات پر اس کتاب میں محض اشارتاً تذکرہ کیا گیا ہے۔

ہم اللہ ﷻ سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں اپنی مدد سے ہمکنار کرے اور ہمارے اوپر اپنا فضل فرمائے اور ہمیں عزت اور اپنے کرم سے نوازے تا کہ یہ امت پھر خیرالاُمت بن کر ابھرے جو لوگوں کی بھلائی کیلئے اُٹھائی گئی ہے، نیز یہ ریاست دنیا کی بہترین ریاست بنے جو دنیا کے کونے کونے میں خیر پھیلائے اور عدل وانصاف قائم کرے۔ اُس دن مؤمنین اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت سے خوش ہوں گے اور مومنین کے سینوں کو راحت ملے گی۔

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ رب العالمین.

تمہید

قبل یہ کہ ریاستِ خلافت کے اداروں کی تفصیلات پر بحث ہو، ضروری ہے کہ مندرجہ ذیل امور بیان کردئے جائیں۔

اول: اسلام کا نظامِ حکومت جو اللہ رب العالمین نے فرض قرار دیا ہے وہ نظامِ خلافت ہے، جس میں خلیفہ کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ پر بیعت دے کر اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے ذریعے حکمرانی کرنے کیلئے مقرر کیا جاتا ہے۔ اس بات کے دلائل کثرت سے وارد ہوئے ہیں جو کتاب اللہ، سنتِ رسول ﷺ اور اجماعِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ماخوذ ہیں۔

کتاب اللہ کو دیکھیں تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ هُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ﴾

''پس آپ لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ احکامات کے ذریعے فیصلہ کریں اور جو حق آپ کے پاس آ چکا ہے، اسے چھوڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے گا'' (المائدہ: 48)

اور فرمایا:

﴿وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ هُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ﴾

''اور یہ کہ آپ ﷺ ان کے درمیان اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ (احکامات) کے ذریعے فیصلہ کریں اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے گا۔ اور ان سے محتاط رہیں کہ کہیں یہ اللہ کے نازل کردہ بعض (احکامات) کے بارے میں آپ ﷺ کو فتنے میں نہ ڈال دیں'' (المائدہ: 49)

اللہ تعالیٰ کا رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم کہ اللہ کے نازل کردہ احکامات سے ہی فیصلے کئے جائیں، فی الحقیقت رسول اللہ ﷺ کی پوری امت سے خطاب ہے۔ اس سے یہ مفہوم ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ایسا حاکم متعین کیا جائے جو اللہ کے نازل کردہ احکام سے امت پر حکومت کرے۔ اس خطاب میں امر کا صیغہ اس امر کو حتمی حکم بنا رہا ہے کیونکہ خطاب ایسے موضوع کے متعلق ہے جو کہ فرض ہے، جو کہ اس حکم کے قطعی (فرض) ہونے کا قرینہ ہے، جیسا کہ اصولِ شریعت میں بیان کیا گیا ہے۔ نیز جو حاکم رسول اللہ ﷺ کے بعد امت پر اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام سے حکومت کرتا ہے، وہ خلیفہ ہی ہوتا ہے اور یہ کہ ایسا نظام حکومت نظامِ خلافت ہی ہے۔ اور یہ دلیل اس کے علاوہ ہے کہ حدود اور تمام شرعی احکام کا قائم کیا جانا فرض ہے اور یہ تمام احکامات ایک حکمران ہی نافذ کرسکتا ہے، اور یہ ایک مسلمہ قاعدہ ہے کہ (**ما لا یتم الواجب إلا به فهو واجب**) یعنی ''جس چیز کے بغیر کوئی فرض پورا نہ ہوتا ہو اُس چیز کو انجام دینا بھی فرض ہو جاتا ہے''۔ یعنی ایسے حاکم کا نصب کیا جانا فرض ہے جو شریعت کو قائم کرے۔ ایسے حاکم کو خلیفہ کہتے ہیں اور ایسے نظامِ حکومت کو نظامِ خلافت کہتے ہیں۔

جہاں تک سنتِ رسول کا تعلق ہے، تو نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے بیان کیا کہ اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا تھا:

((من خلع يداً من طاعة لقي اللّٰه يوم القيامة لا حجة له و من مات وليس في عنقه بيعة مات ميتة جاهلية))

''جس نے (امیر کی) اطاعت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اُس کے پاس اپنے اس عمل کا کوئی جواز نہ ہوگا۔ اور جو کوئی اس حال میں مر گیا کہ اُس کی گردن پر بیعت کا طوق نہ ہو، تو وہ جاہلیت کی موت مرا'' (مسلم)

لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے یہ فرض قرار دیا کہ ہر ایک مسلمان کی گردن پر بیعت کا طوق موجود ہو ورنہ اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ اور رسول ﷺ کے بعد خلیفہ کے سوا کسی اور کی بیعت نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا یہ حدیث یہ فرض قرار دیتی ہے کہ بیعت کا طوق ہر مسلم کی گردن پر ہو یعنی خلیفہ کے وجود کا ہونا لازمی ہے کہ جس کے نتیجے میں ہر مسلمان کی گردن پر بیعت موجود ہو جاتی ہے۔ مسلم نے الاعرج سے اور انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إنما الإمام جُنّة يُقَاتَلُ مِن ورائه و يتقى به))

''بے شک امام (خلیفہ) ایک ڈھال کی مانند ہے، جس کے پیچھے رہ کر لڑا جاتا ہے اور اسی کے ذریعے تحفظ حاصل ہوتا ہے''

اسی طرح مسلم نے ابو حازم کی روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں پانچ سال ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا اور میں نے اُن سے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء كلما هلك نبي خلفه نبي، وإنه لا نبي بعدي، وستكون خلفاء فتكثر، قالوا فما تأمرنا؟ قال: فُوا ببيعة الأول فالأول، وأعطوهم حقهم، فإن اللّٰه سائلهم عما استرعاهم))

''بنی اسرائیل کی سیاست انبیاء کیا کرتے تھے۔ جب کوئی نبی وفات پاتا تو دوسرا نبی اس کی جگہ لے لیتا جبکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے، بلکہ بڑی کثرت سے خلفاء ہوں گے۔ صحابہ نے پوچھا: آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم ایک کے بعد دوسرے کی بیعت کو پورا کرو اور ان کا حق اُنہیں ادا کرو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کی رعیت کے بارے میں پوچھے گا جو اللہ نے انہیں دی''

ان احادیث میں خلیفہ کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایک ڈھال یعنی بچاؤ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ کو ڈھال قرار دینا ایک خبر ہے جس میں امام کی تعریف کی گئی ہے اور اِس تعریف میں طلب موجود ہے؛ کیونکہ یہ خبر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف سے ہے اور اگر ایک

خبر میں کسی بات کی مذمت کی گئی ہو تو یہ اُس بات کو ترک کر دینے کا مطالبہ ہے، اور اگر ایسی خبر میں کسی بات کی تعریف کی گئی ہو تو یہ اس فعل کو کرنے کا مطالبہ ہے۔ نیز اگر ایسے مطلوبہ فعل پر کسی حکمِ شرعی کے قائم ہونے کا دار و مدار ہو، یا ایسے حکم کو ترک کرنے پر کسی حکمِ شرعی کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو، تو ایسی صورت میں اس حکم کو سرانجام دینے کی طلب ایک قطعی طلب بن جاتی ہے، یعنی وہ حکم فرض ہوتا ہے۔ ان احادیث میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ خلفاء ہی وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے امور کی دیکھ بھال کرتے ہیں، جو دراصل اُن کے قیام کا مطالبہ ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے خلیفہ کی اطاعت کرنے کا حکم دیا ہے اور جو کوئی اُس کی خلافت سے تنازعہ کرے اُس سے قتال کرنے کا حکم دیا ہے، جس کا مطلب ہے کہ خلیفہ کو مقرر کرنا اور خلافت کی حفاظت کے لیے ان لوگوں سے لڑنا جو خلافت کے معاملے میں خلیفہ سے تنازعہ کریں، مسلمانوں پر فرض ہے۔ مسلم نے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((ومن بايع إماماً فأعطاه صفقة يده، وثمرة قلبه، فليطعه إن استطاع. فإن جاء آخر ينازعه، فاضربوا عنق الآخر))

''اور جو شخص کسی امام (خلیفہ) کی بیعت کرے تو وہ اسے اپنے ہاتھ کا معاملہ اور دل کا پھل دے دے (یعنی اس کی اتھارٹی کو مکمل طور پر تسلیم کر لے)، پھر اسے چاہیے کہ وہ حسبِ استطاعت اس کی اطاعت بھی کرے۔ اگر کوئی دوسرا شخص آئے اور پہلے خلیفہ سے تنازع کرے تو دوسرے کی گردن اڑا دو''

لہٰذا خلیفہ کی اطاعت کا حکم اُس کے قیام کا حکم ہے اور خلیفہ سے تنازعہ کرنے والے سے لڑنے کا حکم اس بات پر حتمی قرینہ ہے کہ خلیفہ ہمیشہ ایک ہی ہو۔

جہاں تک اجماعِ صحابہ کی بات ہے، تو تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کے پیش رو (یعنی خلیفہ) مقرر کرنے کی ضرورت پر اجماع کیا۔ پھر انہوں نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد عمر رضی اللہ عنہ اور ان کی وفات کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ بننے پر اتفاق کیا۔ خلیفہ کے تقرر پر اجماعِ صحابہ کی تاکید اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کے خلیفہ کے تقرر میں مصروف ہو گئے اور انہوں نے آپ ﷺ کی تدفین میں تاخیر کی۔

اور صحابہ کرام کہ جن پر تدفین کا کام فرض تھا، اُن میں سے بعض اس کام کو چھوڑ کر خلیفہ کے نصب کرنے کے کام میں مشغول رہے اور دیگر صحابہ ان کے اس عمل پر خاموش رہے اور تدفین میں دو راتوں کی تاخیر میں وہ بھی شریک تھے، جبکہ وہ اس بات پر قادر تھے کہ ایسی تاخیر سے انکار کر کے ازخود تدفین کو انجام دے دیں۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات پیر کے دن واقع ہوئی، اور آپ کا جسمِ اطہر منگل کی رات اور دن کو بلا تدفین رہا۔ اور جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت ہوئی تو اس کے بعد رسول اللہ کی تدفین بدھ کی رات کے وسط میں کی گئی۔ یعنی تدفین میں دو راتوں کی تاخیر کی گئی، اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت آپ ﷺ کی تدفین سے پہلے مکمل کر لی گئی۔ چنانچہ یہ تدفین کو چھوڑ کر خلیفہ کے تقرر کے عمل پر صحابہ کرام کا اجماع ٹھہرا، اور یہ اسی وقت ہوسکتا تھا جب خلیفہ کا تقرر کرنا میت کے دفن سے زیادہ اہم فرض ہو۔ اسی طرح تمام صحابہ اپنی تمام عمر خلیفہ کے تقرر کے فرض ہونے پر متفق رہے، گو کہ اُن کے درمیان اس بات پر اختلافِ رائے رہا کہ خلیفہ کون بنے گا لیکن اس پر مطلقاً اختلاف نہیں ہوا کہ خلیفہ کا تقرر کیا جانا چاہئے؛ نہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد اور نہ ہی خلفاء راشدین میں سے کسی کی وفات کے وقت۔ لہٰذا خلیفہ کے نصب کئے جانے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ اجماع مضبوط اور صریح دلیل ہے۔

دوم: یہ بات جان لینا ضروری ہے کہ اسلام کا نظامِ حکومت یعنی خلافت، اپنی مخصوص شکل و ہیئت کے اعتبار سے دنیا کے موجودہ تمام حکومتی نظاموں سے جداگانہ حیثیت کا حامل ہے؛ خواہ اُس بنیاد کے لحاظ سے جن پر یہ نظام قائم ہے؛ یا اپنے مخصوص افکار، مفاہیم و تصورات، معیار اور احکام کے اعتبار سے، کہ جن کے ذریعے اِس نظام میں امور اور معاملات کی نگہداشت ہوتی ہے؛ یا پھر اپنے آئین اور قوانین کے اعتبار سے جو نافذ کئے جاتے ہیں؛ یا پھر اپنی خاص شکل کے لحاظ سے جو ریاستِ خلافت کی ہوتی ہے اور یہ شکل و ہیئت پوری دنیا کے تمام دیگر نظام ہائے حکومت سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

خلافت کوئی بادشاہت کا نظام نہیں ہے، اور نہ ہی یہ اُس سے مطابقت یا مشابہت رکھتا ہے، کیونکہ بادشاہت میں بادشاہ کا بیٹا اُس کے بعد اقتدار کا وارث ہوتا ہے اور اس میں امت

کوکوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس نظامِ خلافت میں وراثت نہیں ہوتی بلکہ امت کی جانب سے بیعت دیا جانا ہی خلیفہ کے نصب کرنے کا طریقہ ہوتا ہے۔ پھر بادشاہت کے نظام میں بادشاہ کو ایسے امتیازی حقوق حاصل ہوتے ہیں جو اُس کے سوا رعیت میں سے کسی اور فرد کو حاصل نہیں ہوتے اور یہ امتیازات بادشاہ کو قانون سے بالاتر بناتے ہیں، نیز بادشاہ کے نام سے ملک پہچانا جاتا ہے۔ بعض نظاموں میں بادشاہ کا وجود تو ہوتا ہے لیکن وہ حکومت نہیں کرتا، اور بعض دیگر نظاموں میں بادشاہ کو مکمل تصرف حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنی مرضی سے ملک اور عوام پر حکومت کرتا ہے اور اُس کی ذات کو چھوا بھی نہیں جا سکتا خواہ وہ کتنا بھی ظلم کرے یا برا سلوک کرے۔ جبکہ نظامِ خلافت میں خلیفہ کو رعایا سے کسی بھی طرح کی فوقیت حاصل نہیں ہوتی جیسی کہ بادشاہ کو اُن کے نظام میں حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی عدالتی معاملات میں کوئی ایسے امتیازی حقوق حاصل ہوتے ہیں کہ وہ عوام سے کسی بھی طرح منفرد یا بالاتر ہو؛ نیز خلیفہ بادشاہت کے نظام کی طرح اِس ریاست کی علامت بھی نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس خلیفہ حکومت واقتدار کے معاملہ میں امت کا نائب ہوتا ہے، جسے امت منتخب کرتی ہے اور اپنی مرضی کے ساتھ اسے بیعت دیتی ہے تاکہ وہ اس پر اللہ تعالیٰ کی شریعت کا نفاذ کرے۔ نیز خلیفہ اپنے تمام تصرفات اور احکامات اور عوام کے معاملات اور مفادات (مصالح) کی دیکھ بھال میں شریعت کے احکامات کا پابند ہوتا ہے۔

خلافت کوئی نوآبادیاتی طرز کا نظام نہیں ہے، کیونکہ نوآبادیاتی شہنشاہی نظام اسلام سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔ جن علاقوں پر اسلام کے مطابق حکمرانی کی جاتی ہے وہاں نوآبادیات کی طرح حکومت نہیں کی جاتی بلکہ اس انداز سے کی جاتی ہے جو نوآبادیاتی نظام کے برعکس ہے، اگرچہ وہاں مختلف رنگ ونسل کے لوگ آباد ہوں اور تمام علاقے ایک ہی مرکز سے منسلک ہوں؛ کیونکہ نوآبادیاتی نظام میں مختلف رنگ ونسل کے لوگوں کو برابری کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ حکومتی، مالیاتی اور اقتصادی امور میں مرکز نوآبادی کے ساتھ امتیازی سلوک برتتا ہے۔

جبکہ حکمرانی میں اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ ریاست کے تمام علاقوں میں عوام کے ساتھ، مختلف رنگ ونسل رکھنے کے باوجود کسی عصبیت کے بغیر مساویانہ سلوک کیا جائے۔ اسلام قومیت

کے تصور کو مسترد کرتا ہے اور ریاست کے غیر مسلم شہریوں کو انکے پورے پورے حقوق و واجبات احکامِ شریعہ کے مطابق عطا کرتا ہے۔ وہ اسی انصاف سے استفادہ حاصل کرتے ہیں جو مسلمانوں کو مہیا ہوتا ہے اور مسلمانوں ہی کی طرح ان کا محاسبہ بھی کیا جاتا ہے۔ کسی بھی عدالت میں رعایا کے کسی بھی فرد کو، خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ہو، کوئی ایسے امتیازی حقوق حاصل نہیں ہوتے جو کسی اور شہری کو حاصل نہ ہوں، خواہ وہ مسلم ہی ہو۔ اس مساواتی سلوک کے لحاظ سے خلافت کا نظام شہنشاہت سے مختلف ہوتا ہے، اس میں مختلف علاقوں یا صوبوں کی حیثیت شہنشاہیت کی طرح نوآبادیات (colonies) کی نہیں ہوتی جن کا استحصال کیا جاتا ہو اور نہ ہی انہیں ایسے چشموں کی مانند سمجھا جاتا ہے جن سے مرکز کی سیرابی مقصود ہو۔ „ š ž Š تمام علاقوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہے، خواہ ان کے درمیان کتنا ہی فاصلہ ہو اور ان میں مختلف رنگ و نسل کے کتنے ہی لوگ آباد ہوں، ان میں سے ہر علاقہ اُس ریاست کے جسم کے ایک عضو کی مانند ہوتا ہے۔ اِن علاقوں میں لوگوں کو وہی حقوق و مراعات حاصل ہوتی ہیں جو مرکز کے عوام یا کسی دوسرے علاقے کے لوگوں کو میسر ہوں۔ نیز حکومت کا اقتدار، نظام اور قانون تمام علاقوں کیلئے یکساں ہوتے ہیں۔

خلافت کوئی وفاقی (Federal) نظام نہیں ہے، جہاں مختلف علاقے اپنی مقامی حکومت کے معاملے میں خودمختار ہوں اور محض عمومی مرکزی اقتدار کے اعتبار سے متحد ہوں۔ اس کے برخلاف خلافت وحدت کا نظام ہوتا ہے، جہاں مثلاً مغرب میں مراکش اور مشرق میں خراسان کی وہی حیثیت ہوگی جو قاہرہ کے علاقے الفیوم کی ہے، خواہ قاہرہ خلافت کا دارالحکومت ہی ہو۔ نیز تمام علاقوں یا صوبوں کی مالیات اور اُن کا بجٹ یکساں بنیادوں پر ہوگا، جو تمام عوام کی بہبود اور مفاد کیلئے صرف کئے جانے کیلئے ہے خواہ یہ عوام کسی بھی صوبے یا علاقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ لہٰذا اگر کسی صوبے کی آمدنی اُس کی ضروریات سے دوگنی ہو تو بھی اُس پر جو خرچ کیا جائے گا وہ اُس صوبے کی ضروریات کے تناسب سے ہوگا نہ کہ اُس کی آمدنی کے لحاظ سے؛ اس کے برعکس اگر کسی صوبے کی آمدنی اُس کی ضروریات کے بقدر نہیں ہو تو اس بات کا لحاظ نہیں کیا جائے گا اور اُس صوبے پر ریاست کے عام بجٹ میں سے اُس کی ضروریات کے بقدر خرچ کیا جائے گا، خواہ اُس

صوبے کی آمدنی اس کی ضروریات پوری کرنے کیلئے کافی ہو یا نا کافی۔

خلافت کوئی جمہوری نظام نہیں ہے، جمہوری نظام کا آغاز بادشاہت کے نظام کا ردِّعمل تھا۔ بادشاہی نظام میں بادشاہ اپنے ملک اور عوام پر اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق حکومت وتصرف کیا کرتا تھا، وہ اپنی مرضی سے قوانین وضع کرتا تھا۔ پھر جمہوری نظام آیا اور اقتدار وبالادستی عوام کو منتقل کر دی گئی اور اس نظام کو جمہوری نظام کہا گیا۔ اب عوام قوانین وضع کرنے لگے اور حلال وحرام طے کرنے لگے اور اعمال کو اچھا یا برا قرار دینے لگے۔ صدارتی طرزِ جمہوریت میں حکمرانی صدرِ جمہوریہ اور اُس کے وزراء کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جبکہ پارلیمانی جمہوریت میں حکمرانی وزارتی کابینہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس طرح وزراء کی مجلس کے بااقتدار ہونے کی مثال بادشاہت کے نظام میں بھی ملتی ہے جہاں بادشاہ حکومت کے اختیارات وزراء کی مجلس کو منتقل کر دیتا ہے اور وہ خود علامتی طور پر بادشاہ رہتا ہے اور براہِ راست حکمرانی نہیں کرتا۔

رہی بات اسلام کی تو اس میں قانون سازی کا اختیار عوام کو نہیں ہوتا بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے، اور اُس کے سوا کسی اور کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ وہ حلال اور حرام طے کرے۔ قانون سازی کا حق انسانوں کو دے دینا اسلام میں بہت بڑا گناہ ہے۔ جب سورۂ توبہ کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾

''انہوں نے اللہ سے ہٹ کر اپنے فقہا اور راہبوں کو اپنا ربّ بنالیا'' (التوبہ: 31)

تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی تفسیر یوں فرمائی کہ اُن کے علما اور راہب اُن کیلئے قانون وضع کرتے تھے اور حلال کو حرام نیز حرام کو حلال قرار دے دیتے تھے، اور لوگ اس معاملے میں اپنے علما اور راہبوں کی اطاعت کرتے تھے؛ اُن لوگوں کے اسی عمل کو رسول اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں اپنے علما اور راہبوں کو اپنا ربّ بنالینا قرار دیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کی بجائے حلال وحرام کا خود تعین کرنا عظیم گناہ ہے۔ ترمذی نے عدي بن حاتم سے روایت کیا ہے کہ:

((أتيت النبي و فی عنقي صليب من ذهب، فقال: يا عدی اطرح عنك هذا الوثن وسمعته يقرأ في سورة البراء ة: ﴿اِتَّخُذُوٓا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ﴾قال: اَمَا اِنَّهُم لم يكونوا يعبدونهم، ولكنهم كانوا إذا احَلّوا لهم شيئاً اسۡتَحَلُّوه وإذا حَرَّمُوا عليهم شيئاً حرموه))

''میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور میرے گلے میں سونے کی صلیب تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: اے عدی، اس بُت کو اُتار پھینکو؛ پھر میں نے سنا آپ ﷺ سورۂ توبہ کی یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے: ''انہوں نے اللہ سے ہٹ کر اپنے علما اور راہبوں کو اپنا ربّ بنالیا''۔ پھر فرمایا: وہ لوگ اپنے راہبوں کی عبادت نہیں کیا کرتے تھے، لیکن جب اُن کے راہب کوئی چیز اُن کیلئے حلال کر دیتے تو وہ اُس کو حلال سمجھتے اور جب وہ راہب کسی چیز کو حرام قرار دے دیتے تو وہ لوگ اُسے حرام مان لیتے تھے''

اسی طرح اسلام کے نظامِ حکومت میں اقتدار نہ تو وزراء کی کابینہ کو حاصل ہوتا اور نہ ہی انہیں کسی خاص محکمے کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے اور نہ ہی وزراء کو ایسے خصوصی اختیارات حاصل ہوتے ہیں کہ اُن کا خودمختار بجٹ ہو کہ جس میں ایک مد میں مصارف کم ہوں اور دوسرے میں مصارف بجٹ شدہ تخمینے سے زیادہ ہوں اور ایسی صورتِ حال میں رقوم کو ایک مد سے دوسری مد میں منتقل کرنے کیلئے تاخیر طلب کاروائیاں کرنا پڑیں جو عوامی بہبود کے کاموں میں رکاوٹ بن جائیں۔ پھر اس پر مزید یہ کہ کسی ایک بہبودی کام کیلئے ایک سے زیادہ وزارتوں یا محکموں کی دخل اندازی ہو، جبکہ درست یہ تھا کہ عوام کی بہبود کے کام ایک انتظامی ڈھانچے کے تحت ہوں۔ جمہوری نظامِ حکومت میں اقتدار مختلف وزارات میں تقسیم ہو جاتا ہے اور مجلس وزارت کو اجتماعی شکل میں اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ جبکہ اسلامی نظام میں جمہوری نظام کے برخلاف ایسی مجلسِ وزراء نہیں ہوتی کہ جو اجتماعی اختیارات کی حامل ہو۔ بلکہ امت خلیفہ کو اِس بات پر بیعت دیتی ہے کہ وہ اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کے ذریعے حکومت کرے اور پھر خلیفہ اپنے لئے معاونین یا وزراء تفویض مقرر کرتا ہے جو خلافت کی ذمہ داریاں نباہنے میں خلیفہ کی معاونت کرتے

ہیں۔ چنانچہ یہ معاونین لغوی معنوں میں وزراء ہیں یعنی یہ ایسے امور میں خلیفہ کی معاونت کرتے ہیں جو اُن کے سپرد کئے جائیں۔

اسلام کا نظام حکومت جمہوریت کے حقیقی معنوں میں جمہوری نظام نہیں ہوتا کیونکہ جمہوریت میں قانون سازی کا اختیار عوام کے پاس ہوتا ہے یعنی وہ حلال وحرام؛ اچھا اور برا طے کرنے میں احکامِ شریعت کے پابند نہیں ہوتے کیونکہ ایسی پابندی آزادی کی راہ مسدود کرتی ہے۔ کفار اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ جمہوریت کو اس کے حقیقی معانی کے ساتھ مسلمان قبول نہیں کریں گے، اسی لئے مغربی دنیا کے استعماری کفار اور اِس دور میں بالخصوص امریکہ جمہوریت کو مسلم ممالک میں رائج کرنے کیلئے اسے دلکش بنا کر پیش کر رہے ہیں اور یہ کہہ کر دھوکہ دے رہے ہیں کہ جمہوریت میں بنیادی امر یہ ہے کہ اس میں حکمران کو منتخب کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ مسلم ممالک ایسے حالات سے دوچار ہیں جہاں اُن پر ظلم کیا جا رہا ہے، زبانیں بزورِ طاقت بند کی جا رہی ہیں اور اُن پر جابر حکومتیں مسلط ہیں؛ خواہ وہ بادشاہتیں ہوں یا وہ جمہوریت کہلاتی ہوں، اس تمام تر کی وجہ سے کفار کیلئے یہ کہہ کر جمہوریت کو دلفریب انداز میں پیش کرنا آسان ہے کہ جمہوریت تو محض حکمران کو چُننے کا طریقہ ہے؛ اور یہ کفار جمہوریت کی اصلیت کو گول کر جاتے ہیں یعنی قانون وضع کرنا، حلال وحرام طے کرنا انسان کا حق ہے نہ کہ انسان کے ربّ کا۔ یہاں تک کہ بعض ''اسلام پسندوں اور ان کے مشائخ'' نے بھی اس فریب کو اچھی یا بری نیت سے قبول کر لیا ہے۔ جب آپ اُن سے جمہوریت کے بارے میں دریافت کریں تو وہ اُس کے جائز ہونے کی بات اس بناء پر کرتے ہیں کہ یہ تو حکمران کو منتخب کرنے کا طریقہ ہے، نیز جو لوگ اِس جمہوریت کو بدنیتی سے فروغ دے رہے ہیں وہ اپنی لچھے دار باتوں میں جمہوریت کی اصلیت کو چھپا جاتے ہیں جس کا تعین خود اس نظام کے وضع کرنے والوں نے کیا ہے کہ جمہوریت میں قانون سازی کا اختیار عوام کے پاس ہوتا ہے اور وہ اکثریتِ رائے سے جو قانون چاہیں وضع کر سکتے ہیں۔ وہ جائز اور ناجائز کا تعین کر سکتے ہیں یا کسی عمل کے اچھا یا برا ہونے کو طے کر سکتے ہیں؛ نیز یہ کہ اس نظام جمہوریت میں فرد اپنے افعال وتصرفات میں ''آزاد'' ہے؛ وہ چاہے تو شراب پیئے، ٹھیک سمجھے تو زنا کرے، چاہے

مرتد ہو جائے، مقدسات کی حرمت کو پامال کرے؛ جمہوریت و آزادی کے نام پر اُسے اِن سب کا اختیار ہے۔ یہی جمہوریت ہے اور یہی اُس کا مقصد ہے۔ پھر ایک مسلمان جو اسلام پر ایمان رکھتا ہو، کیسے جرأت کر سکتا ہے کہ وہ جمہوریت کے جائز ہونے یا جمہوریت کے اسلامی ہونے کی بات کرے؟!

رہی بات حاکم کے امت کی جانب سے منتخب کئے جانے کی تو یہ معاملہ نصوص سے ثابت ہے۔ اسلام میں بالادستی یعنی Sovereignty شریعت کو حاصل ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کسی کے خلیفہ بننے کیلئے یہ بنیادی شرط ہے کہ اُسے لوگوں کی طرف سے بیعت دی جائے۔ اسلام میں خلیفہ کے انتخاب کا طریقہ اُس وقت سے عملاً رائج ہے جبکہ سارا عالم جابرانہ بادشاہتوں کے اندھیروں میں تھا۔ جس کسی نے بھی خلفائے راشدین کے انتخاب کے عمل کا بغور مطالعہ کیا ہو، وہ واضح طور پر دیکھ سکتا ہے کہ کس طرح اہل حل وعقد اور مسلمانوں کے نمائندوں کی جانب سے ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کی بیعت کو پورا کیا گیا تھا۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، جنہیں یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ مسلمانوں کے نمائندوں (جو کہ مدینہ کے لوگ تھے) کی رائے معلوم کریں۔ وہ ہر ایک سے رائے لیتے تھے، ایک گھر سے دوسرے گھر چکر لگاتے تھے، عورتوں اور مردوں سے دریافت کرتے تھے کہ وہ لوگ امیدواروں میں سے کس کو خلافت کیلئے پسند کرتے ہیں، وہ اسی کام میں جتے رہے یہاں تک کہ اُنہیں لوگوں کی رائے معلوم ہوگئی اور پھر عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت ہوئی۔

مختصر یہ کہ جمہوریت کفر کا نظام ہے، اس لئے نہیں کہ جمہوریت میں حکمران کا انتخاب کیا جاتا ہے؛ یہ تو اصل موضوع ہی نہیں ہے؛ بلکہ اس لئے کہ جمہوریت میں قانون سازی کا اختیار عوام کا ہے نہ کہ عوام کے ربّ کا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنِ الۡحُكۡمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾

''فیصلے کا اختیار تو بس اللہ ہی کا ہے'' (الانعام: 57)

اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوۡكَ فِيۡمَا شَجَرَ بَيۡنَهُمۡ ثُمَّ لَا يَجِدُوۡا فِىۡٓ

اَنۡفُسِهِمۡ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيۡتَ وَيُسَلِّمُوۡا تَسۡلِيۡمًا﴾

''(اے محمد ﷺ) آپ کے رب کی قسم! یہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک یہ آپ ﷺ کو اپنے باہمی اختلافات میں فیصلہ کرنے والا نہ بنالیں، پھر جب آپ ﷺ فیصلہ کر دیں تو یہ اپنے اندر کوئی گرانی محسوس نہ کریں، بلکہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں'' (النساء: 65)

تشریع یا قانون سازی کے صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کیلئے خاص ہونے کے اثبات میں دلائل متعدد ہیں اور معروف ہیں۔

علاوہ ازیں جمہوریت ایسی شخصی آزادیوں کو پروان چڑھاتی ہے کہ مرد و عورت حرام و حلال کا لحاظ کئے بغیر جو جی چاہے کر سکتے ہیں؛ اسی طرح مذہبی آزادی کہ جس کے تحت کوئی اپنے مذہب سے پھر سکتا ہے اور بغیر کسی شرط کے اپنا مذہب تبدیل کر سکتا ہے؛ پھر مِلکیت کی آزادی جس کے ذریعے طاقت ور کثیر وسائل پر تسلط جما کر کمزور کا استحصال کرتا ہے اور نتیجتاً دولتمند کی دولت میں اور مفلس کی مفلسی میں اضافہ ہوتا ہے؛ نیز اظہارِ رائے کی آزادی، جو کہ حق بات کہنے کے لیے نہیں، بلکہ یہ امت کے تقدسات کی پامال کے لیے ہے، جس کے ذریعے اسلام سے گستاخی اور اس کی اہانت بھی اظہارِ رائے کے نام پر جائز ہو جاتی ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو نکتہ دان اور اعلیٰ و عمدہ رائے دان گردانا جاتا ہے اور اُس کے سامنے انعام واکرام کے انبار لگائے جاتے ہیں۔

لہٰذا جیسا اوپر ذکر ہوا، اسلام کا نظام حکومت یعنی خلافت، نہ تو بادشاہت کا نظام ہے، نہ نوآبادیاتی شہنشاہیت کا، نہ یہ وفاقی ہے اور نہ ہی خلافت کوئی جمہوری نظام ہے۔

سوم: نظامِ خلافت کا حکومتی اور انتظامی ڈھانچہ موجودہ تمام نظاموں سے مختلف ہے، اگرچہ بظاہر کچھ باتیں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں۔ ریاستِ خلافت کا ڈھانچہ وہ ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منوّرہ ہجرت کرنے کے بعد استوار کیا تھا، جب آپ نے اسلامی ریاست قائم کی تھی اور آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین نے بھی اسی حکومتی اور انتظامی تنظیم کو اختیار کیا تھا۔

اس موضوع سے متعلق نصوص کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ریاستِ خلافت میں حکومتی اور انتظامی تنظیم حسبِ ذیل ہے:

1) خلیفہ	2) معاونین (وزراءِ تفویض)	3) وزراءِ تنفیذ
4) والی	5) امیر جہاد (فوج)	6) شعبۂ داخلی امن
7) شعبۂ خارجہ	8) شعبۂ صنعت	9) عدلیہ
10) عوامی مفاد و بہبود کا ڈھانچہ	11) بیت المال	12) ذرائع ابلاغ
13) مجلسِ امت (مشورہ ومحاسبہ)		

آئندہ ابواب وصفحات میں اِن اداروں کی تفصیلات اور اُن کے دلائل پر بحث کی جائے گی، اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے اس دعا کے ساتھ کہ وہ ہمیں اپنی مدد ونصرت سے نوازے، اور ہمیں خلافتِ راشدہ الثانی قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے، جس سے اسلام اور مسلمانوں کی عزت ووقار قائم ہو اور کفر اور کفار ذلیل ورسوا ہوں اور خیر وبھلائی سارے عالم کے کونے کونے میں پھیل جائے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمۡرِهٖ ؕ قَدۡ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیۡءٍ قَدۡرًا﴾

''یقیناً اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے۔ تحقیق اللہ نے ہر ایک چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے''

(طلاق:3)

اللہ تعالیٰ ہی مدد پہنچانے والا ہے اور اسی پر ہمارا اعتماد ہے۔

۱۴ ذوالحجۃ ۱۴۲۵ھ بمطابق: ۲۴ جنوری ۲۰۰۵ء

ریاستِ خلافت کی حکومتی اور انتظامی تنظیم

خلیفہ

خلیفہ حکومت واقتدار اور شریعت کے احکام کے نفاذ میں امت کا نائب ہوتا ہے، کیونکہ اسلام میں اقتدار اور اتھارٹی امت کو حاصل ہے، اور وہ جس کو چاہے اپنا نائب مقرر کر سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُمت پر یہ فرض کیا ہے کہ وہ شریعت کے تمام احکامات کو نافذ کرے۔

چونکہ خلیفہ کا تقرر مسلمان کرتے ہیں اور وہ حکومت واقتدار اور احکام شریعت کے نفاذ میں اُن کا نائب ہوتا ہے؛ لہٰذا کسی کے خلیفہ ہونے کیلئے یہ ناگزیر ہے کہ امت اُس کی بیعت کرے، خلافت کیلئے اِس بیعت سے وہ شخص امت کا نائب بن جاتا ہے اور اس بیعت سے اُس کی خلافت منعقد ہو جاتی ہے اور اُسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی امت پر اُس کی اطاعت فرض ہو جاتی ہے۔

خلیفہ جو کہ مسلمانوں کے امور کی دیکھ بھال کرتا ہے اس وقت تک خلیفہ نہیں بنتا جب تک کہ اُسے امت کے اہل حل وعقد اپنی مرضی واختیار سے بیعتِ انعقاد نہ دے دیں اور اُس شخص میں خلافت کے انعقاد کی تمام شرائط پائی نہ جاتی ہوں نیز یہ کہ وہ اپنی خلافت کا انعقاد ہوتے ہی شریعت کے احکامات کا نفاذ شروع کر دے۔

لقب:

خلیفہ کو جس نام سے پکارا جاتا ہے وہ یہ ہیں: خلیفہ، امام یا امیر المؤمنین۔ یہ القاب صحیح

احادیث اور صحابۂ کرام کے اجماع سے ثابت ہیں اور خلفائے راشدین کے القابات بھی یہی تھے۔
مسلم نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إذا بويع لخليفتين فاقتلوا الآخر منهما))

''جب دو خلفاء کو بیعت دے دی جائے تو بعد والے کو قتل کر دو''

نیز مسلم نے ہی عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اُنھوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا:

((...من بايع إماماً فأعطاه صفقة يدهٖ، و ثمرة قلبهٖ، فليطعه...))

''... جو کسی امام کو صدقِ دل سے بیعت دے دے، تو اسے چاہئے کہ وہ اُس کی اطاعت کرے...''

نیز عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے:

((خيار ائمتكم الذين تحبونهم و يحبّونكم، وتصلّون عليهم و يصلّون عليكم))

''تمہارے بہتر امام وہ ہوں گے جو تم سے محبت رکھیں اور تم اُن سے محبت کرو گے؛ تم اُن کیلئے دعائیں کرو اور وہ تمہارے لئے دعائیں کریں گے''

ان احادیث میں حکمران، جو شریعت کے احکام نافذ کرتا ہے، اُس کیلئے خلیفہ یا امام کے القاب آئے ہیں۔

اِن القاب کے علاوہ خلیفہ کیلئے امیر المؤمنین کا جو لقب وارد ہوا ہے، وہ حاکم کی مستدرک میں ابن شہاب کی روایت سے ثابت ہے، جسے امام ذہبی نے صحیح بتایا ہے اور طبرانی نے بھی نقل کیا ہے جس کے راویوں کے بارے میں امام ہیثمی فرماتے ہیں کہ وہ صحیح ہیں، مستدرک میں یہ الفاظ منقول ہیں:

ابنِ شہاب روایت کرتے ہیں کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن سلیمان بن حثمہ

سے دریافت کیا: ''ابوبکر کے عہد میں خطوط میں لکھا جاتا تھا: ''خلیفۂ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے''۔ پھر عمر اپنے ابتدائی دور میں لکھتے تھے: ''ابوبکر کے خلیفہ کی جانب سے''۔ تو پہلا شخص کون تھا جس نے امیر المؤمنین لکھنا شروع کیا؟ اس پر ابوبکر بن سلیمان نے کہا: مجھے شفاء نے بتایا جو کہ پہلی چند مہاجر عورتوں میں سے تھیں، کہ عمر بن خطاب نے عراق کے عامل کو لکھا تھا کہ وہ دو اشخاص بھیجے جو اُنھیں عراق اور وہاں کے عوام کے احوال بتائیں۔ چنانچہ عاملِ عراق نے لبید بن ربیعہ اور عدي بن حاتم کو روانہ کیا۔ جب یہ لوگ مدینہ پہنچے اور مسجد میں داخل ہوئے تو عمرو بن العاص سے ملاقات ہوئی اور اِنھوں نے عمرو سے کہا کہ وہ اُنھیں امیر المؤمنین سے ملوائیں۔ عمرو نے اُن لوگوں سے فرمایا: اللہ کی قسم، تم نے انہیں ان کے صحیح نام سے پکارا ہے، ہم مؤمنین ہیں اور وہ امیر ہیں۔ پھر عمرو بن العاص بھاگ کر عمر کے پاس پہنچے اور کہا: السلام علیکم اے امیر المؤمنین! عمر نے فرمایا کہ اے ابن العاص، تمہیں اس نام کا خیال کیسے آیا۔ اللہ کی قسم تمہیں اس کا جواز پیش کرنا ہو گا۔ عمرو بن العاص نے جواب دیا کہ ابن ربیعہ اور عدي بن حاتم میرے پاس پہنچے اور انہوں نے اپنے اونٹ مسجد کے صحن میں باندھے اور کہا کہ ہمیں امیر المؤمنین سے ملوا دیجئے، اللہ کی قسم یہ نام اُن ہی کا دیا ہوا ہے۔ ہم مؤمنین ہیں اور آپ ہمارے امیر ہیں۔ بس اُس ہی دن سے کتابت میں یہ لقب استعمال ہونے لگا۔ شفاء دراصل ابوبکر بن سلیمان کی دادی تھیں۔ پھر اِس لقب کا اطلاق بعد کے خلفاء پر ہونے لگا اور صحابہ کرامؓ کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔

خلیفہ کیلئے شرائط:

خلیفہ کیلئے یہ لازم ہے کہ اُس میں سات شرائط پائی جاتی ہوں، اگر یہ شرائط موجود ہوں تب ہی وہ خلافت کا اہل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ خلافت کیلئے بیعت کا انعقاد ہوسکتا ہے۔ یہ سات شرائط انعقاد کی شرطیں ہیں اور اِن میں کسی ایک کی بھی عدم موجودگی سے خلافت کا انعقاد نہیں ہوتا۔

انعقاد کی شرائط:

پہلی شرط یہ ہے کہ خلیفہ مسلمان ہو۔ یہ مطلقاً صحیح نہیں کہ ایک کافر شخص خلیفہ بنے اور نہ ہی اس کی اطاعت واجب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا﴾

''اور اللہ نے کفار کو مومنین پر کوئی اختیار یا غلبہ نہیں دیا'' (النساء: 141)

پھر یہ تو واضح ہے کہ حکمرانی، ایک حاکم کی طرف سے محکوم پر غلبے کا قوی ترین ذریعہ ہے۔ مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں لفظ 'لن' یعنی ''کبھی نہیں'' استعمال کیا ہے جو قطعی ممانعت کا قرینہ ہے کہ مسلمانوں پر کفار کی کبھی بھی حکمرانی نہیں ہوسکتی، خواہ یہ حکمرانی خلافت کی ہو یا کوئی اور۔ جب اللہ تعالیٰ نے کافر کو مسلمان پر اختیار ہی نہیں دیا تو گویا اللہ نے مسلمانوں پر یہ حرام کر دیا ہے کہ وہ حکومت کیلئے کسی کافر کا انتخاب کریں۔

مزید یہ کہ خلیفہ اولی الامر ہوتا ہے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مسلمانوں پر یہ شرط رکھ دی ہے کہ اُن کا اولی الامر مسلمان ہی ہو۔ ارشاد فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اُن کی جو صاحبِ امر ہیں'' (النساء: 59)

﴿وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَ لَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَ اِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ﴾

''جب اُن کے پاس امن یا خوف کی کوئی بات پہنچتی ہے، تو اسے پھیلا دیتے ہیں حالانکہ اگر وہ اسے رسول ﷺ اور اپنے میں سے صاحبِ امر لوگوں تک پہنچا دیتے تو بات ایسے لوگوں کے علم میں آ جاتی جو اُن کے درمیان اس کی تحقیق کر سکتے ہیں'' (النساء: 83)

قرآنِ حکیم میں جہاں کہیں بھی لفظ 'اولی الامر' آیا ہے، اسی قرینہ کے ساتھ آیا ہے کہ 'اولی الامر' تم ہی میں سے ہو، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اولی الامر مسلمانوں میں سے ہی

ہونا چاہیے۔ جب کہ خلیفہ وہ ولی امر ہوتا ہے جو دیگر اولی الامر مقرر کرتا ہے جیسے معاونین، والی اور عامل، لہٰذا خلیفہ کیلئے مسلمان ہونا شرط ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ خلیفہ مرد ہو۔ یہ جائز نہیں کہ وہ عورت ہو، یعنی یہ لازمی ہے کہ وہ مرد ہی ہو، اُس کا عورت ہونا صحیح نہیں ہے۔ بخاری نے ابی بکرہ ؓ سے روایت کیا کہ جب رسول اللہ ﷺ کو اہل فارس کے متعلق یہ اطلاع پہنچی کہ اُنھوں نے کسریٰ کی بیٹی کو حکمران بنالیا ہے، تو آپ ﷺ فرمایا:

((لَن يفلح قومٌ ولّوا أمرهم امرأة))

''وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جو اپنے اوپر عورت کو ولی امر (حکمران) بنالے''

یہاں رسول اللہ ﷺ کا یہ خبر دینا کہ کہ جو قوم اپنے اوپر عورت کو والی امر بنالے وہ فلاح نہیں پائے گی، عورت کے ولی امر بننے کی نفی ہے، کیونکہ یہاں مطالبے کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس خبر میں وہ قوم جو کسی عورت کو ولی امر بناتی ہے، کی مذمت یہ کہہ کر کی گئی ہے کہ اسے کبھی فلاح حاصل نہیں ہوگی۔ چنانچہ یہاں عورت کے ولی امر بننے کی ممانعت ایسے قرینہ کے ساتھ آئی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ممانعت کا یہ مطالبہ قطعی ہے، جو عورت کے ولی امر ہونے کو حرام بناتا ہے۔ عورت کے ولی ہونے سے یہاں مراد اُس کا خلافت یا کسی ایسے عہدے پر فائز ہونا ہے جو حاکمیت کی صفت سے متّصف ہو؛ کیونکہ کسری کی بیٹی کی حکمرانی والی حدیث کا موضوع حکمرانی ہے نہ کہ موضوع محض کسریٰ کی بیٹی کی ولایت کا واقعہ۔ اسی طرح یہاں موضوع عمومی نوعیت کا بھی نہیں ہے کہ اُس میں ہر چیز شامل ہو۔ پس اس میں حکمرانی کے علاوہ دیگر امور شامل نہیں جیسا کہ عورت کا عدلیہ میں تقرر، یا مجلس شوریٰ کے لیے انتخاب یا عورت کا حکمران کے چناؤ کے عمل میں شامل ہونا۔ یہ تمام امور مذکورہ بالا وضاحت کی بنا پر جائز ہیں۔

تیسری شرط خلیفہ کا بالغ ہونا ہے۔ یعنی ایک نابالغ شخص کا خلیفہ ہونا جائز نہیں۔ ابو داؤد نے علی بن ابی طالب ؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((رُفع القلم عن ثلاثة:عن الصبي حتى يبلغ؛وعن النائم حتى يستيقظ؛ و عن المعتوه حتى يبرأ.))

''تین قسم کے لوگوں سے قلم اٹھالیا گیا ہے: لڑکا، جب تک کہ وہ سن بلوغ کو نہ پہنچ جائے؛ سویا ہوا شخص، جب تک کہ وہ نیند سے نہ جاگ جائے؛ اور مجنون (دیوانہ) جب تک کہ وہ ٹھیک نہ ہو جائے''

علی رضی اللہ عنہ سے ہی دوسرے الفاظ میں یہ روایت منقول ہے:

((رفع القلم عن ثلاثة:عن المجنون المغلوب على عقله حتى يفيق؛ وعن النائم حتى يستيقظ؛وعن الصبي حتى يحتلم.))

''تین قسم کے لوگوں سے قلم اٹھالیا گیا ہے: مجنون جسکی عقل درست نہیں، جب تک کہ وہ ٹھیک نہ ہو جائے؛ سویا ہوا شخص جب تک کہ وہ جاگ نہ جائے؛ اور نابالغ لڑکا جب تک کہ بلوغت کو نہ پہنچ جائے''

جس پر سے قلم اُٹھالیا گیا ہو یعنی جو محاسبے سے بری الذمہ کر دیا گیا ہو، اسے اس کے اپنے معاملات پر اختیار و تصرف دینا درست نہیں، اور وہ شرعاً غیر مکلّف ہے۔ پس اس کیلئے صحیح نہیں ہے کہ وہ خلیفہ بنایا جائے، یا حکمرانی واقتدار کی کسی اور ذمہ داری پر فائز ہو۔ نابالغ کے خلیفہ بنانے کے ناجائز ہونے کی دلیل اس بات سے بھی ملتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک نابالغ لڑکے کی بیعت لینے سے انکار کر دیا تھا۔ بخاری نے ابی عقیل بن زہرہ بن معبد نے اپنے دادا عبداللہ ابن ہشام سے روایت کیا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تھا، جب وہ اپنی والدہ زینب بنت حمید کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچے اور اُن کی والدہ نے آپ ﷺ سے اُن کی (عبداللہ ابن ہشام کی) بیعت لینے کی گزارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((هو صغير. فمسح رأسه و دعا له...))

''وہ (ابھی) چھوٹا ہے، اور اسکے سر پہ ہاتھ پھیرا اور اس کیلئے دعا فرمائی...''

لہٰذا اگر ایک نابالغ بچے کی بیعت غیر معتبر ہے، اور اس پر واجب نہیں کہ خلیفہ کو بیعت دے، تو اُس کا خلیفہ بننا بدرجہ اولیٰ جائز نہیں۔

چوتھی شرط خلیفہ کا عاقل ہونا ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ وہ مجنون ہو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((رفع القلم عن ثلاثة:عن المجنون المغلوب على عقله حتى يفيق))

''تین قسم کے لوگوں کا محاسبہ نہیں ہوگا: مجنون جس کی عقل درست نہیں، جب تک کہ وہ ٹھیک نہ ہو جائے...''

جس پر سے قلم اُٹھا لیا گیا ہو یعنی جو محاسبے سے بری الذمہ کر دیا گیا ہو، وہ غیر مکلّف ہے۔ اور عقل ہی وہ شرط ہے جس پر انسان کے تصرفات کی صحت اور ذمہ داری کا دارومدار ہے۔ خلیفہ کے تصرفات یہ ہیں کہ وہ حکمرانی کرے اور شرعی ذمہ داریوں کو نافذ کرے، چنانچہ یہ صحیح نہیں کہ وہ مجنون ہو کیونکہ ایک مجنون خود اپنے ہی معاملات طے نہیں کر سکتا، تو پھر وہ بدرجہ اولیٰ دوسروں کی ذمہ داری نہیں اُٹھا سکتا۔

پانچویں شرط خلیفہ کا عادل (راست باز) ہونا ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ وہ فاسق ہو۔ خلیفہ کا عادل ہونا خلافت کے انعقاد اور دوام دونوں کی لازمی شرط ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے گواہ کیلئے عادل ہونے کی شرط رکھی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرماتا:

﴿وَّاَشهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾

''اور اپنے میں سے دو صاحبِ عدل آدمیوں کو گواہ بنالو'' (طلاق:2)

خلیفہ جو گواہ سے اعلیٰ عہدے کا حامل ہے، اس کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ عادل ہو، کیونکہ جب ایک گواہ کا صحیح ہونا عدل سے مشروط ہے، تو خلیفہ کیلئے یہ تو شرط بدرجۂ اولیٰ ضروری ہے۔

چھٹی شرط خلیفہ کا آزاد ہونا ہے۔ کیونکہ ایک غلام اپنے آقا کی ملکیت ہوتا ہے اور از خود اس کا اپنے اعمال پر کوئی تصرف نہیں ہوتا، پھر اس کا دوسرں پر تصرف کیونکر ہوسکتا ہے۔ پس وہ دوسروں کا حکمران نہیں ہوسکتا۔

ساتویں شرط خلیفہ کا خلافت چلانے کا اہل ہونا ہے۔ ایک شخص میں اس اہلیت کا ہونا شرط ہے کہ وہ خلافت کے تقاضوں کو پورا کر سکے، کیونکہ یہ اسکی بیعت کا ہی تقاضا اور لازمی جزو ہے۔ ایک شخص جو اس اہلیت سے عاجز ہے وہ قرآن اور سنت، جن پر کہ اسے بیعت دی گئی، کے ذریعے لوگوں کے امور کا اہتمام نہیں کرسکتا۔ محکمہ مُظالم کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ ان نواقص یا معذوریوں کی فہرست کا تعین کرے جو کہ خلیفہ میں موجود نہیں ہونی چاہئیں تا کہ اسے اس قابل سمجھا جائے کہ وہ خلافت کو چلانے کی ذمہ داری کو پورا کرسکتا ہے۔

ترجیحی شرائط:

اب تک جو شرائط بیان کی گئیں، یہ خلافت کے انعقاد کی لازمی شرائط تھیں، اِن کے علاوہ کسی اور چیز کا خلافت کے انعقاد کیلئے لازمی شرط ہونا صحیح نہیں ہے، گو کہ خلافت کے لیے ترجیحی شرائط ہوسکتی ہیں، اگر وہ نصوص سے ثابت ہوں یا ایسے شرعی حکم کے ذیل میں ہوں جو صحیح نصوص سے ثابت ہو۔ کیونکہ کسی شرط کے لازمی شرط ہونے کیلئے یہ ضروری ہے کہ اُس شرط کی دلیل میں طلبِ جازم (قطعی طلب) پائی جاتی ہو، جو اس شرط کے لازم ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ اگر کسی حکم میں کوئی شرط ایسی موجود ہو جس میں پائی جانے والی طلب، طلبِ جازم نہ ہو، تو ایسی شرط پھر افضلیت یا ترجیحی شرط ہوگی اور وہ انعقاد کی لازمی شرط نہ ہوگی۔ اور ان سات شرائط کے علاوہ کسی شرط کی دلیل میں طلبِ جازم نہیں پائی جاتی، لہٰذا یہی سات شرائط خلافت کے انعقاد کیلئے لازمی ہیں اور ان کے علاوہ جن شرائط کی دلیل صحیح ہے وہ فقط افضلیت کی شرائط ہیں، مثلاً قبیلۂ قریش میں سے ہونا، مجتہد ہونا یا اسلحہ کے استعمال میں مہارت رکھنا وغیرہ، جن کے متعلق وارد ہونے والی دلیل غیر جازِم ہے۔

خلیفہ کے تقرر کا طریقہ:

جہاں شریعت نے امت پر خلیفہ کی تقری کو فرض قرار دیا ہے، وہیں شریعت نے اُس کی تقرری کے طریقے کا بھی تعین کر دیا ہے، اور یہ طریقہ قرآن، رسول اللہ ﷺ کی سنّت اور صحابۂ کرام کے اجماع سے ثابت ہے۔ یہ بیعت کا طریقہ ہے۔ خلیفہ کی تقرری اُسے مسلمانوں کی جانب سے کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ پر عمل کی بیعت سے ہوتی ہے۔ مسلمانوں سے مراد سابق خلیفہ کی حکمرانی کے تحت موجود مسلمان ہیں، اگر خلافت قائم ہو۔ اور اگر خلافت قائم نہ ہو تو اُس خطے کے مسلمان جہاں خلافت قائم ہونے جا رہی ہو۔

اس بیعت کا طریقہ مسلمانوں کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو بیعت دینے سے، اور آپ ﷺ کی طرف سے ہمیں خلیفہ کو بیعت دینے کے حکم سے ثابت ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی بیعت نبوت پر نہیں بلکہ حکمرانی پر بیعت تھی؛ یہ بیعت عمل کی تھی نہ کہ آپ ﷺ کی تصدیق کی بیعت۔ آپ ﷺ کو بہ اعتبارِ حاکم بیعت دی گئی تھی نہ کہ بحیثیتِ نبی یا رسول کے؛ کیونکہ نبی یا رسول کی تصدیق کرنا ایمان ہوتا ہے نہ کہ بیعت۔ اور آپ کی بیعت ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے تھی۔ بیعت کا ذکر قرآن وحدیث میں ہے؛ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾

"اے نبی ﷺ جب آپ کے پاس مؤمن عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی اور چوری نہیں کریں گی اور زنا نہیں کریں گی اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی اور کوئی ایسا بہتان نہیں باندھیں گی جو انہوں نے خود اپنے ہاتھوں پیروں کے سامنے گھڑ لیا ہو اور کسی نیک کام میں آپ ﷺ کی حکم عدولی نہیں کریں گی۔ تو آپ ان سے بیعت لے لیں" (الممتحنہ:12)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ﴾

جولوگ آپ ﷺ سے بیعت کرتے ہیں، وہ یقیناً اللہ سے بیعت کرتے ہیں، ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے'' (الفتح:10)

بخاری نے روایت کیا: کہ ہمیں اسماعیل نے بیان کیا کہ مجھے مالک بن سعید نے بتایا: مجھے عبادہ بن الولید نے خبر دی جنہیں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ:

((بایعنا رسول اللّٰهِ ا علی السمع و الطاعة والمنشط والمكره،وأن لا ننازع الأمر أهله،وأن نقوم أو نقول بالحق حيث ما كنا،لا نخاف في اللّٰهِ لومة لائم.))

''ہم نے رسول اللہ ﷺ پر اس بات کی بیعت کی کہ ہم خوشحالی میں اور سخت حالات میں بھی سنیں گے اور اطاعت کریں گے، اور ہم صاحب اقتدار سے اس کے امر میں تنازعہ نہیں کریں گے، اور ہم ہر موقع اور جگہ پر حق کہیں گے اور حق کا ساتھ دیں گے، اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے''

نیز مسلم میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((...ومن بايع اماماً فأعطاه صفقة يدهٖ، و ثمرة قلبهٖ فليطعه إن إستطاع. فإن جاء آخر ينازعه، فاضربوه عنق الآخر))

''جو کوئی ایک امام (خلیفہ) کے ہاتھ پر صدقِ دل سے بیعت دے، تو اسے چاہئیے کہ وہ حسبِ استطاعت اسکی اطاعت کرے، اور اگر کوئی دوسرا آ کر خلیفہ سے تنازعہ کرے، تو اسکی گردن اُڑا دو''

نیز مسلم ہی نے روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((إذا بويع لخليفتين فأقتلوا الآخر منهما))

''جب دو خلفاء کو بیعت دے دی جائے تو بعد والے کو قتل کر دو''

اور مسلم نے ابو حازم کی روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں پانچ سال ابو ہریرہ ﷺ کے ساتھ رہا اور اُن سے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء ' كلما هلك نبي خلفه نبي' وإنه لا نبي بعدي ، وستكون خلفاء فتكثر ' قالوا: فما تأمرنا؟ قال: فُوا ببيعة الأول فالأول' وأعطوهم حقهم ' فإن اللّٰه سائلهم عما استرعاهم))

''بنی اسرائیل کے امور کی دیکھ بھال انبیاء کیا کرتے تھے۔ جب کوئی نبی وفات پاتا تو دوسرا نبی اس کی جگہ لے لیتا، جبکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، بلکہ بڑی کثرت سے خلفاء ہوں گے۔ صحابہ نے پوچھا: آپ ﷺ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم ایک کے بعد دوسرے کی بیعت کو پورا کرو اور ان کا حق انہیں ادا کرو۔ جبکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کی رعیت کے بارے میں پوچھے گا جو اُس نے انہیں دی''

چنانچہ اس بارے میں نصوص واضح ہیں کہ کتاب وسنت میں خلیفہ کے تقرر کا طریقہ بیعت ہی ہے۔ تمام صحابۂ کرام اِس کو سمجھتے تھے اور اسی پر اُن کا عمل بھی تھا، جو خلفائے راشدین کی بیعت سے ظاہر ہے۔

خلیفہ کے تقرر کی عملی کارروائی اور خلیفہ کی بیعت:

خلیفہ کی بیعت سے قبل وہ عملی کاروائی جس کے نتیجے میں خلیفہ کی تقرری انجام کو پہنچتی ہے ،اُس کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے فوراً بعد خلفائے راشدین یعنی ابو بکر صدیق، عمر، عثمان اور علی ابن ابی طالب ﷺ کے ساتھ ہوا ۔ اس کاروائی پر تمام صحابہ ﷺ نے سکوت اختیار کیا اور اِس پر اتفاق کیا جبکہ اُن کیلئے یہ ممکن تھا کہ اگر یہ عمل شریعت کے مخالف ہوتا تو وہ اس کا انکار کر دیتے، کیونکہ یہ عمل اتنا اہم تھا کہ اس پر مسلمانوں کی اجتماعی ہیئت کا انحصار اور اسلامی حکمرانی کی بقاء کا دارومدار تھا۔ اگر اِن خلفاء کے تقرر کے عمل پر بغور نظر ڈالی جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ بعض صحابۂ کرام نے سقیفۂ بنی ساعدۃ میں خلافت کیلئے مباحثہ کیا۔ اس وقت خلافت کے

لیے جن لوگوں کو نامزد کیا گیا وہ سعد، ابو عبیدۃ، عمر اور ابو بکر ﷺ تھے، لیکن اُن میں سے ابو عبیدہ ﷺ اور عمر ﷺ اس بات پر راضی نہیں تھے کہ وہ ابو بکر ﷺ کے حریف بنیں۔ لہٰذا یہ معاملہ صرف ابو بکر ﷺ اور سعد ﷺ کے مابین ہو گیا اور بحث و مباحثے کے نتیجے میں ابو بکر ﷺ کی بیعت کی گئی۔ پھر اگلے دن مسلمانوں کو مسجدِ نبوی میں بلایا گیا جہاں اُنہوں نے ابو بکر ﷺ کو بیعت دی۔ سقیفۂ بنی ساعدۃ کی بیعت، بیعتِ انعقاد تھی جس سے ابو بکر ﷺ مسلمانوں کے خلیفہ بنے جبکہ دوسرے دن مسجدِ نبوی میں ہونے والی بیعت، بیعتِ اطاعت تھی۔ اور جب ابو بکر صدیق ﷺ کو یہ ادراک ہو گیا کہ اُن کی بیماری جان لیوا ہے، اور خاص طور پر اُس وقت جبکہ مسلم فوج کے سپاہی اُس وقت کی بڑی طاقتوں یعنی فارس اور روم سے جنگ پر تھے، تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو بلا کر مشورہ کیا کہ ان کے بعد کون خلیفہ ہو اور یہ مشورے تین ماہ تک جاری رہے۔ جب یہ مشورے مکمل ہو گئے اور آپ ﷺ نے بیشتر مسلمانوں کی رائے جان لی تو آپ نے مسلمانوں سے وعدہ لیا اور عمر ﷺ کے نام کا اعلان کیا، یا آج کی اصطلاح کے مطابق عمر ﷺ کو نامزد کیا کہ وہ اُن کے بعد خلیفہ ہوں گے۔ ابو بکر ﷺ کا عمر ﷺ کو نامزد کرنا، ان کی طرف سے اپنے بعد عمر ﷺ کو خلیفہ بنانے کا عقد نہ تھا۔ کیونکہ مسلمان ابو بکر ﷺ کی وفات کے بعد مسجدِ نبوی میں جمع ہوئے اور عمر ﷺ کو بیعت دی جس سے وہ مسلمانوں کے خلیفہ بنے، نہ کہ محض اُن مشاورتوں سے یا ابو بکر ﷺ کے عہد لینے سے۔ کیونکہ اگر ابو بکر ﷺ کا عمر ﷺ کو نامزد کرنا اُن کی خلافت کا انعقاد تصور ہوتا، تو مسلمانوں کو اُنہیں بیعت دینے کی ضرورت نہ ہوتی۔ یہ بات اُن دلائل کے علاوہ ہے جو اوپر گزرے ہیں اور جن سے واضح ہے کہ کوئی بھی شخص مسلمانوں کی طرف سے بیعت دیے بغیر مسلمانوں کا خلیفہ نہیں بن سکتا۔ پھر جب عمر ﷺ زخمی ہوئے اور مسلمانوں نے اُن سے کسی کو نامزد کرنے کا مطالبہ کیا تو اُنہوں نے انکار کیا لیکن پھر مسلمانوں کے مسلسل اصرار کے پیشِ نظر اس معاملے کو چھ اشخاص میں محدود کر دیا یعنی اُن چھ اشخاص کو نامزد کر دیا اور صہیب ﷺ کو امامت کی ذمہ داری سونپی اور اُنہیں اس بات پر مقرر فرمایا کہ وہ اُن کی جانب سے نامزد کردہ ان چھ افراد پر نظر رکھیں جب تک کہ وہ تین دن کی مقرر کردہ میعاد میں اپنے میں سے کسی کو خلیفہ منتخب نہ کر لیں اور پھر صہیب ﷺ سے فرمایا:

(...اگر پانچ افراد کسی ایک شخص پر متفق ہو جائیں اور چھٹا انکار کرے تو اُس کی گردن اُڑا دو...)

اس بات کو طبری نے اپنی تاریخ میں اور ابن قتیبـــــــــــــہ نے اپنی کتاب ''امامت و سیاست''، جو تاریخ الخلفاء کے نام سے مشہور ہے، میں نقل کیا ہے، نیز ابن سعد نے اپنی کتاب طبقات الکبریٰ میں بھی اسے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ نے ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کو پچاس سپاہیوں کے دستے کے ہمراہ اِن نامزدگان کی حفاظت پر مقرر کیا اور مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ اِن افراد کی نشست کیلئے جگہ متعین کریں۔ عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد یہ نامزدگان جمع ہوئے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا: ''آپ لوگوں میں سے کون اپنے آپ کو اس معاملے سے خارج کرتا ہے، اور اپنا حق اپنے میں سے سب سے بہتر شخص کو دیتا ہے؟''۔ اس پر سبھی حضرات خاموش رہے۔ پھر خود عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اپنے آپ کو خارج کرتا ہوں۔ پھر آپؓ نے ایک ایک سے مشورہ کیا اور فرداً فرداً سوال کیا کہ وہ اپنے علاوہ اور کس کو خلافت کیلئے سب سے زیادہ مستحق سمجھتے ہیں۔ باقی تمام افراد کے جوابات عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ کے حق میں آئے۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں سے پوچھا کہ وہ ان دو افراد میں سے کس کو خلافت کیلئے پسند کرتے ہیں، آپ رضی اللہ عنہ نے مردوں اور عورتوں دونوں سے مشورہ کیا، اور صرف دن کے ہی وقت نہیں بلکہ اس کام میں رات کو بھی لگے رہے اور عوام کی رائے سے واقف ہوئے۔ بخاری نے المِسوَر بن مخرمہ سے روایت کیا ہے کہ وہ کہتے ہیں: عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے میرے دروازے پر رات کو دستک دی یہاں تک کہ میں اُٹھ گیا، جبکہ میں آرام سے سو رہا تھا، اور کہا ''تم سو رہے ہو؟ میں تو اِن تین راتوں کو بمشکل ہی سو پایا ہوں''۔ پھر جب لوگوں نے فجر کی نماز پڑھی تو عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت ہوئی، جس سے وہ خلیفہ بنے، نہ کہ عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے اُن چھ لوگوں کو نامزد کرنے سے۔ پھر عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا گیا جس کے بعد علی رضی اللہ عنہ کو اہلِ مدینہ اور اہلِ کوفہ نے بیعت دی اور اس بیعت کے ذریعے وہ خلیفہ بنے۔

اِن صحابہ رضی اللہ عنہم کی بیعت کو باریک بینی سے دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ خلافت کے نامزدگان کا عوام میں اعلان ہو جاتا تھا جن میں سے ہر ایک میں خلافت کے انعقاد کی تمام شرائط

موجود ہوتی تھیں، پھر اہلِ حل وعقد سے، جو عوام کے نمائندے ہوتے تھے، مشورہ کیا جاتا تھا۔ خلفائے راشدین کے عہد میں اِن نمائندوں کی حیثیت معروف تھی کیونکہ یہ حضرات یا تو صحابۂ کرام ﷺ تھے یا بہرحال اہلِ مدینہ تھے۔ جسے بھی صحابۂ کرام یا ان کی اکثریت بیعت دے دیتی وہ خلیفہ بن جاتا اور اُس کی اطاعت واجب ہوجاتی، پھر مسلمان اس کی اطاعت کی بیعت کرتے تھے۔ یوں خلیفہ کا تقرر ہوتا تھا جو حکومت واقتدار میں امت کا نائب ہوتا تھا۔

یہ وہ فہم ہے جو کہ خلفائے راشدین کی بیعت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عمر ﷺ کی طرف سے چھ افراد کی نامزدگی اور عثمان ﷺ کی بیعت سے مزید دو امور کے متعلق آگاہی حاصل ہوتی ہے، وہ دو امور یہ ہیں: اول: ایک وقتی امیر کا ہونا جو نئے خلیفہ کی تنصیب تک ریاستی امور کا اہتمام کرے، دوم: نامزدگان کی تعداد کو زیادہ سے زیادہ چھ لوگوں تک محدود کرنا۔

امیرِ مؤقت (عبوری امیر):

خلیفہ کو اختیار حاصل ہے کہ جب اسے ادراک ہوجائے کہ اُس کی موت کا وقت قریب ہے تو وہ اپنا منصب چھوڑنے سے کچھ عرصہ قبل ایک وقتی امیر مقرر کردے، جو سابق خلیفہ کی وفات کے بعد سے کام شروع کردیتا ہے اور آئندہ خلیفہ کی تقرری تک مسلمانوں کے امور کو سنبھالتا ہے۔ اس کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ تین دن کے اندر اندر نئے خلیفہ کے تعیّن کو یقینی بنائے۔

اِس عبوری امیر کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ احکام کی تبنّی کرے؛ کیونکہ احکامات کی تبنّی کرنا اُس خلیفہ کا اختیار ہوتا ہے، جس کی امت بیعت کرتی ہے۔ نیز اُس کیلئے یہ بھی صحیح نہیں کہ وہ خود خلافت کا امیدوار ہو یا امیدواروں کا تعین کرے، کیونکہ عمر ﷺ نے نامزد کردہ صحابہ کے علاوہ دیگر لوگوں میں سے عبوری امیر بنایا تھا۔

اِس عبوری امیر کی میعاد نئے خلیفہ کی تقرری کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی ہے کیونکہ اُس کی میعاد اس کام کو پورا کرنے تک ہی ہوتی ہے۔

اس بات کی دلیل کہ صہیب ﷺ عبوری امیر تھے، جنہیں عمر ﷺ نے مقرر فرمایا تھا، یہ ہے:

عمر ﷺ کا اُن چھ نامزدگان سے یہ فرمانا: ''اور اِن دنوں جب تم لوگ مشورے میں ہوگے، صہیب (ﷺ) تمہاری امامت کریں گے''۔ پھر آپ ﷺ نے صہیب ﷺ سے فرمایا: ''تم لوگوں کی تین دن تک نماز میں امامت کرنا'' اور فرمایا: ''اگر پانچ افراد ایک شخص پر متفق ہو جائیں اور چھٹا انکار کرے، تو تلوار سے اس کا سر اُڑا دو...'' یعنی صہیب لوگوں پر امیر ہوئے اور اُنہیں صلاۃ کا امیر بنایا گیا، اس وقت امارتِ صلاۃ کے معنی لوگوں کی امارت کے تھے، پھر مزید یہ کہ اُنہیں عقوبات (سزاؤں) کے نفاذ اختیار دیا گیا تھا اور عمرؓ نے یہ کہا تھا کہ ''اُس کا سر اُڑا دو''۔ اور قتل کی سزا کا نفاذ ایک حکمران ہی کر سکتا ہے۔

یہ واقعہ تمام صحابہ کی جماعت کے سامنے ہوا اور کسی نے اس سے انکار نہیں کیا، لہٰذا یہ صحابہ کا اجماع ٹھہرا کہ خلیفہ کسی شخص کو عبوری امیر مقرر کرے جو اگلے خلیفہ کی تقرری تک کی کارروائی کا نگران ہو۔ اسی بنیاد پر یہ بھی جائز ہے کہ خلیفہ آئین میں یہ قانونی شق اختیار کرے کہ اگر خلیفہ کسی شخص کو عبوری امیر مقرر کئے بغیر وفات پا جائے، جو نئے خلیفہ کی تنصیب کی کاروائی پوری کرے، تو ایک شخص کو وقتی طور پر امیر مقرر کیا جائے گا۔

یہاں ہم یہ تبنّی کرتے ہیں کہ اگر خلیفہ اپنے مرض الموت میں کسی کو وقتی طور پر امیر مقرر نہ کرے تو اُس کے معاونین میں سے جو عمر میں سب سے بڑا ہو، وہی عبوری امیر ہوگا، لیکن اگر اسے خلافت کے امیدوار کے طور پر نامزد کیا گیا ہو تو پھر وہ معاون جو عمر میں اس نامزد کردہ معاون کے بعد سب سے بڑا ہو، وہ عبوری امیر ہوگا، اور یہی ترتیب رہے گی؛ اور اگر ضروری ہو تو وزرائے تنفیذ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوگا۔

یہ ترتیب اُس وقت بھی ہوگی جب خلیفہ معزول ہو جائے، تو اُس کے معاونین میں جو عمر میں سب سے بڑا ہو، وہی عبوری امیر ہوگا، لیکن اگر وہ نامزدگان میں سے ہو تو پھر وہ معاون جو عمر

میں اس نامزدہ معاون کے بعد سب سے بڑا ہو، اور یہی ترتیب چلے گی؛ اس کے بعد اسی ترتیب سے وزرائے تنفیذ کے ساتھ معاملہ ہوگا۔ اور اگر سب نامزد ہونا چاہیں تو پھر سب سے کم عمر وزیرِ تنفیذ ہی لازمی طور پر عبوری امیر ہوگا۔

خلیفہ کے یرغمال بنا لئے جانے کی صورت میں بھی یہی شکل ہوگی، البتہ اس صورت میں اس کے اختیارات کا تعلق اس امر سے ہے کہ آیا خلیفہ اپنی رہائی پر قدرت رکھتا ہے یا نہیں۔ پس اس وقت امیر کے اختیارات کی تنظیم کے متعلق قانون جاری کیا جائے گا۔

اس عبوری امیر کی حیثیت اُس امیر سے مختلف ہوتی ہے جسے خلیفہ اس وقت مقرر کرتا ہے جب وہ خود سفر یا جہاد پر نکلے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے جہاد پر روانہ ہونے سے قبل یا حجۃ الوداع کیلئے نکلنے سے قبل یا دیگر موقعوں پر امیر مقرر فرمایا تھا۔ ایسے وقت میں جو شخص نائب مقرر کیا جائے گا، لوگوں کے امور کی دیکھ بھال سے متعلق اُس کے اختیارات کا تعین خلیفہ اس نیابت کے تقاضے کے مطابق طے کرے گا۔

نامزدگان کی تعداد کی حد بندی (short listing):

خلفائے راشدین کی تقرری کی کیفیت پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہاں امیدواروں کی تعداد کی حد بندی کی جاتی تھی۔ لہٰذا سقیفہ بنی ساعدہ میں ابوبکر، عمر، ابوعبیدۃ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہم ہی امیدوار تھے۔ لیکن چونکہ عمر رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدۃ رضی اللہ عنہ خلافت کے مسئلے میں اپنے آپ کو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے برابر نہیں سمجھتے تھے لہٰذا اُنہوں نے مقابلہ آرائی نہیں کی اور یوں عملاً صرف ابوبکر رضی اللہ عنہ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ ہی امیدوار رہ گئے۔ پھر سقیفہ بنی ساعدہ میں اہلِ حل وعقد نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بیعتِ انعقاد کی اور اگلے دن مسلمانوں نے مسجدِ نبوی میں اطاعت کی بیعت کی۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لیے نامزد کیا اور اُن کے علاوہ کوئی اور امیدوار نہیں تھا، پھر مسلمانوں نے عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے بیعتِ انعقاد کی اور پھر آپؓ کی بیعتِ اطاعت کی گئی۔

اور عمر ﷺ نے خلافت کے معاملے کو چھ اشخاص میں محدود کیا جن میں سے ایک کو خلیفہ منتخب کیا جانا تھا۔ پھر عبدالرحمٰن ابن عوف ﷺ نے باقی پانچ افراد سے مشاورت کی اور ان کی طرف سے وکیل بنائے جانے کے بعد اس معاملے کو دو لوگوں میں محدود کیا یعنی علی ﷺ اور عثمان ﷺ پر، پھر لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے بعد خلافت کیلئے عثمان ﷺ کے حق میں فیصلہ کیا۔

رہی بات علی ﷺ کی، تو اُن کے علاوہ خلافت کیلئے اور کوئی امیدوار نہیں تھا اور مسلمانوں کی اکثریت نے مدینہ اور کوفہ میں آپؓ کی بیعت کی اور آپؓ چوتھے خلیفہ بنے۔

پس عثمان ﷺ کی بیعت میں دو باتیں واضح ہوئیں: پہلی یہ کہ خلیفہ کے انتخاب کیلئے زیادہ سے زیادہ مدّت تین دن مع ان کی راتوں کے ہے؛ اور دوسری بات یہ کہ نامزدگان یا امیدواروں کی تعداد پہلے چھ تھی جو بعد میں دو ہوگئی، لہٰذا ہم عثمان ﷺ بیعت کے واقعات کو قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں کیونکہ زیر بحث موضوع میں اس کی افادیت ہے:

1) عمر ﷺ کی وفات 24 ہجری میں محرم الحرام کے مہینے میں اتوار کے روز، مردود شخص ابولؤلؤۃ کے زخمی کئے جانے سے ہوئی، اس وقت آپؓ بدھ کے دن، ذی الحجہ کے اختتام سے چار دن قبل، 23 ہجری کو فجر کی نماز کی امامت کے لیے کھڑے تھے۔ پھر جیسا کہ آپؓ نے ہدایت کی تھی، صہیب ﷺ نے نماز میں امامت کی۔

2) عمر ﷺ کی تدفین کے بعد مقداد ﷺ نے ایک گھر میں اُن چھ اشخاص کو جمع کیا جن کے بارے میں عمر ﷺ نے وصیت کی تھی اور جو اہل شوریٰ میں سے تھے۔ ابوطلحہ انصاری ﷺ نے اُن کی پہرے داری کی اور یہ صحابہ مشورے میں مصروف ہوگئے۔ پھر انہوں نے عبدالرحمٰن بن عوف ﷺ کو اپنا وکیل بنایا کہ وہ اُن میں سے ایک خلیفہ طے کریں جس پر وہ لوگ راضی ہوں گے۔

3) عبدالرحمٰن بن عوف ﷺ نے اُن سے گفتگو کی اور ایک ایک سے یہ پوچھا کہ اپنے سوا وہ باقیوں میں سے کس کا خلیفہ بننا پسند کریں گے؟ ہر ایک کا جواب علی ﷺ اور عثمان ﷺ ہی تھا، چنانچہ

عبدالرحمٰن بن عوف ﷺ نے چھ میں سے اِن دو میں خلافت کے معاملے کو محدود کر دیا۔

4) جیسا کہ بیان کیا گیا کہ اس کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف ﷺ نے عوام سے اُن کی رائے معلوم کی۔

5) بدھ کی رات کو یعنی عمر ﷺ کی وفات کی تیسری رات کو عبدالرحمٰن بن عوف ﷺ اپنے بھانجے مسور بن مخرمہ ﷺ کے گھر پہنچے۔ ابن کثیر نے اپنی کتاب ''البدایہ والنھایہ'' میں بیان کیا ہے:
''اُس رات کو، جس کی صبح عمر ﷺ کی وفات کو چوتھا دن ہونا تھا، عبدالرحمٰن بن عوف ﷺ اپنے بھانجے مسور بن مخرمہ ﷺ کے گھر پہنچے، اور کہا اے مسور تم سو رہے ہو! میری تو تین راتوں سے آنکھ بھی نہیں لگ پائی''۔ یعنی عمر ﷺ کی اتوار کی صبح وفات کے بعد پیر، منگل اور بدھ کی رات۔ ''پھر فرمایا جاؤ اور میرے لئے علی اور عثمان ﷺ کو بلا لاؤ۔ اس کے بعد وہ اُن کے ساتھ مسجد کی جانب نکلے اور لوگوں کیلئے عام اعلان کیا کہ نماز کیلئے جماعت کھڑی ہے۔ یہ بدھ کے دن فجر کا وقت تھا۔ پھر آپ نے علی ﷺ کا ہاتھ تھاما اور اُن سے پوچھا کہ کیا وہ کتاب اللہ، سنت رسول ﷺ، ابوبکر ﷺ اور عمر ﷺ کے فعل پر راضی ہونے کی بیعت کرتے ہیں؟ اس پر علی نے اپنا مشہور جواب دیا کہ کتاب اللہ اور سنتِ نبوی پر ہاں، لیکن رہی بات ابوبکر ﷺ اور عمر ﷺ کے فعل پر راضی ہونے کی تو میں اپنا اجتہاد کروں گا۔ آپ نے علی ﷺ کا ہاتھ چھوڑ کر عثمان ﷺ کا ہاتھ تھاما اور وہی سوال دہرایا، جس پر عثمان ﷺ کا جواب تھا: ''اللہ کی قسم! ہاں''۔ پھر عثمان ﷺ پر بیعت ہوگئی۔

صہیب ﷺ نے اُس دن فجر اور ظہر کی نماز میں امامت کی اور عصر کی نماز میں عثمان ﷺ نے مسلمانوں کے خلیفہ کی حیثیت سے امامت فرمائی۔ حالانکہ عثمان ﷺ کی بیعتِ انعقاد کی کارروائی فجر کی نماز کے وقت شروع ہو چکی تھی تاہم ابھی صہیب ﷺ کی ذمہ داری ختم نہیں ہوئی تھی کیونکہ مدینہ کے اہلِ حل وعقد کی عثمان ﷺ کیلئے بیعتِ انعقاد جاری تھی، جو عصر سے ذرا پہلے ہی مکمل ہو پائی۔ صحابہ کرام اُس دن دوپہر تک اور عصر سے کچھ دیر قبل تک بیعت کرتے رہے، جب یہ بیعت عصر سے قبل مکمل ہوگئی تو صہیب ﷺ کی ذمہ داری بھی ختم ہوگئی اور پھر عثمان ﷺ نے عصر کی نماز

میں خلیفہ کی حیثیت سے امامت فرمائی۔

ابن کثیر اپنی کتاب البدایہ والنھایہ میں اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ جب فجر کے وقت عثمان ؓ کی بیعت ہوچکی تھی تو صہیب ؓ نے ظہر کی نماز میں کیوں امامت کی؟:
''... لوگوں نے مسجد میں بیعت کی پھر وہ دارالشوریٰ پہنچے، (جہاں اہلِ شوریٰ مشورے کے لیے جمع ہوتے تھے)، وہاں باقی لوگوں نے اُن کی بیعت کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیعت ظہر کے بعد ہی مکمل ہو پائی، اس لئے اُس دن مسجدِ نبوی میں ظہر کی نماز صہیب ؓ نے پڑھائی۔ اور امیر المؤمنین عثمان ؓ نے جو پہلی نماز پڑھائی وہ عصر کی نماز تھی...''۔

(عمر ؓ کے زخمی ہونے اور وفات پانے، نیز عثمان ؓ کی بیعت کے دن میں کچھ اختلاف ہے، بہرحال ہم نے اس بحث میں وہی دن بیان کیے ہیں جن کا ثبوت قوی ہے)

پس خلیفہ کی وفات یا معزولی کے سبب خلیفہ کا عہدہ خالی ہونے پر اِن امور کو ملحوظ رکھا جانا چاہئے:

1) امیدواری اور نامزدگی کا عمل مہلت کے دنوں میں رات دن لگاتار ہوگا۔

2) محکمۂ مظالم شروطِ انعقاد کی موجودگی یا عدم موجودگی کی بنا پر امیدواروں کی فہرست کی کانٹ چھانٹ کرے گا۔

3) انعقادی شرائط کے حامل امیدواروں کی تحدید (شارٹ لسٹنگ) دو مراحل میں ہوگی؛ پہلی بار چھ امیدوار اور دوسری بار دو۔ ان دونوں مراحل کی انجام دہی مجلسِ امت کے ذریعہ ہوگی، جو امت کی نمائندگی کرتی ہے، کیونکہ یہ امت ہی ہے کہ جس نے عمر ؓ کو اختیار دیا اور انہوں نے چھ افراد کو نامزد کیا، پھر اِن چھ اشخاص نے اپنے میں سے عبدالرحمٰن بن عوف ؓ کو وکیل بنایا، جنہوں نے مشاورت کے بعد اس معاملے کو دو میں محدود کر دیا۔ پس اِن تمام مراحل میں امت یعنی اس کے نمائندے ہی مرجع ہیں۔

4) عبوری امیر کی ذمہ داری نئے خلیفہ کی بیعت مکمل ہونے اور اُس کی تقرری ہوجانے پر ختم ہوتی ہے، نہ کہ محض خلیفہ کے انتخاب کے اعلان پر۔ صہیب ؓ کی ذمہ داری عثمان ؓ کے انتخاب پر ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ اُن کی بیعت پوری ہوجانے پر مکمل ہوئی تھی۔

چنانچہ ان تمام کی روشنی میں قانون جاری کیا جائے گا جس میں تین دن اور ان کی راتوں کے دوران نئے خلیفہ کے انتخاب کی کیفیت کا تعین کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں قانون تیار کیا جاچکا ہے، انشاءاللہ اس پر بحث اور اس کی تبنی مناسب وقت پر کی جائے گی۔

یہ صورتِ حال ایسے وقت کی ہے جب موجودہ خلیفہ کی موت واقع ہوجائے یا وہ معزول ہوجائے اور اُس کی جگہ نئے خلیفہ کا انتخاب مقصود ہو؛ لیکن اس کے برعکس اگر شکل یہ ہو کہ سرے سے خلیفہ کا وجود ہی نہ ہو اور مسلمانوں پر یہ فرض برقرار ہو کہ وہ خلافت قائم کریں، جو اسلام کے احکامات نافذ کرے اور اسلام کی دعوت کو پوری دنیا تک پہنچائے، جیسا کہ 3 مارچ 1924ء بمطابق 28 رجب 1342ھ سے اب تک صورتِ حال ہے، جب استنبول میں خلافت کا انہدام ہوگیا تھا، تو عالمِ اسلام کا ہر ملک اس قابل ہے کہ وہ ایک خلیفہ کی بیعت کرے جس سے خلافت کا انعقاد ہوجائے۔ مسلم ممالک میں سے کسی بھی ملک کے عوام اگر خلیفہ کی بیعت کرتے ہیں جس سے اُس کی خلافت کا انعقاد ہوجائے، تو باقی تمام ممالک کے مسلمانوں پر یہ فرض ہوگا کہ وہ خلیفہ کی اطاعت کی بیعت کریں یعنی بیعت کے ذریعے اس امر کا اظہار کہ وہ خلیفہ کی اطاعت کرتے ہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ اُس ملک میں جہاں کے لوگوں نے بیعتِ انعقاد کی ہے، یہ چار امور موجود ہوں:

1) اُس ملک کا اقتدار اُس کا اپنا ہو جس کا انحصار وہاں کے مسلمانوں پر ہو نہ کہ کسی کافر ملک یا کسی کافر کے اثر کے تحت۔

2) اس ملک میں مسلمانوں کی امان (تحفظ) اسلام کی امان سے ہو، نہ کہ کفر کی امان سے۔ یعنی اس علاقے کا داخلی و خارجی تحفظ اسلامی تحفظ ہو، جو مسلمانوں کی قوت کے بل بوتے پر قائم ہو، جو

ایک خالص اسلامی طاقت ہے۔

3) یہ ریاست فی الفور اسلام کا مکمل اور جامع طور سے نفاذ کرے اور اسلام کی دعوت پہنچانے میں سرگرمِ عمل ہو جائے۔

4) جس خلیفہ کی بیعت کی جائے وہ 'شروطِ انعقاد' پر پورا اترتا ہو۔ اگرچہ 'شروطِ افضلیت' اس میں موجود نہ بھی ہوں۔ کیونکہ اصل چیز شروطِ انعقاد ہیں۔

اگر یہ چار شرائط کسی ریاست میں پوری ہوتی ہوں تو صرف اُسی ریاست کی بیعت سے خلافت قائم ہو جائے گی، اور خلافت کا انعقاد ہو جائے گا اور جس خلیفہ کو صحیح طور سے بیعت دی گئی ہے وہ شرعاً خلیفہ بن جائے گا، نیز اب اُس کے سوا کسی اور کی بیعت درست نہ ہوگی۔

اور اِس کے بعد کسی اور خطے میں بھی کسی اور شخص کی خلافت کے لیے بیعت لی جائے تو وہ بیعت باطل ہوگی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((إذا بويع لخليفتين فأقتلوا الآخر منهما))

''جب دو خلفاء کو بیعت دے دی جائے، تو اُن میں سے بعد والے کو قتل کر دو''

اور آپ ﷺ نے فرمایا:

((...فوا ببيعة الأول فالأول))

''ایک کے بعد دوسرے خلیفہ کی بیعت کو پورا کرو''

اور آپ ﷺ نے فرمایا:

((ومن بايع اماماً فأعطاه صفقة يدهٖ، و ثمرة قلبهٖ، فليطعه إن إستطاع. فإن جاء آخر ينازعه فاضربوه عنق الآخر))

''جو کوئی ایک امام کی صدقِ دل سے بیعت کرے، تو اسے چاہئے کہ وہ حسبِ استطاعت اسکی اطاعت کرے، اور اگر کوئی دوسرا آ کر خلیفہ سے تنازعہ کرے، تو اسکی گردن اُڑا دو''

بیعت کی کیفیت:

ابھی تک ہم نے بیعت کے دلائل بیان کیے اور بیان کیا کہ اسلام میں بیعت ہی خلیفہ کے تقرر کا طریقہ ہے؛ جہاں تک بیعت کے انداز کا تعلق ہے، تو یہ ہاتھوں کے مصافحے سے بھی ہوسکتی ہے اور بذریعہ تحریر بھی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن دینار ؓ کہتے ہیں: میں نے عبداللہ بن عمر ؓ کو دیکھا جب لوگ عبدالملک بن مروان کی بیعت کررہے تھے تو آپ ؓ نے فرمایا: ''لکھو، میں اللہ کے بندے عبدالملک کی اپنی استطاعت کے مطابق سمع و اطاعت، کا اقرار کتاب اللہ اور سنتِ رسول پر عمل کی شرط پر کرتا ہوں''۔

نیز اس کے علاوہ کسی اور ذریعے سے بھی بیعت صحیح ہوسکتی ہے۔

البتہ بیعت کیلئے بالغ ہونا شرط ہے، نابالغ بچے کی بیعت صحیح نہیں ہوتی۔ ابوعقیل زہرہ بن معبد اپنے دادا عبداللہ بن ہشام سے روایت کرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے وقت موجود تھے، کہ وہ (یعنی ابوعقیل کے دادا) اپنی والدہ زینب بنت حمید کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کی والدہ نے رسول اللہ ﷺ سے ان کی بیعت لینے کی فرمائش کی، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((هو صغير، فمسح رأسه و دعا له.))

''یہ ابھی بچہ ہے، اور پھر آپ ﷺ نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کیلئے دعا کی'' (بخاری)

بیعت کیلئے متعین الفاظ کی کوئی شرط نہیں ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ اُن الفاظ میں خلیفہ کیلئے اپنے اعمال میں کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کی پابندی کا ذکر شامل ہو اور یہ کہ بیعت دینے والا خلیفہ کی اطاعت کرے گا خواہ مشکلات ہوں یا آسانی، خوشحالی ہو یا تنگی۔ اِس ضمن میں اس نکتہ کے مطابق ایک قانون صادر کیا جائے گا۔

جب بیعت کرنے والا خلیفہ کو بیعت دے دے، تو یہ بیعت کرنے والے کی گردن پر

امانت ہوتی ہے جس سے وہ رجوع کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ یہ بیعت جب تک دے نہ دی جائے خلافت کے انعقاد کا حق ہے، اور جب یہ بیعت دے دی گئی تو پھر بیعت دینے والا اس کا پابند ہوجاتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ اس بیعت سے رجوع بھی کرنا چاہے تو یہ اُس کیلئے جائز نہیں رہتا۔ بخاری میں جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ سے اسلام پر بیعت کی اور جب وہ بیماری میں مبتلا ہوا تو اُس نے کہا کہ مجھے میری بیعت سے بری کردیجئے، آپ ﷺ نے انکار کردیا، وہ دوبارہ آیا اور پھر کہا کہ مجھے میری بیعت سے آزاد کردیجئے، آپ ﷺ نے پھر انکار دیا، وہ چلا گیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

((المدينة كالكير ،تنقي خبثها ويَنْصَع طِيبُها))

''مدینہ بھٹی کی طرح ہے جو گندگی کو نکال دیتی ہے اور پاکیزگی کو رہنے دیتی ہے''

نافع سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ خَلَعَ يَدَاً مِنْ طَاعَةٍ لَقِي اللّٰهَ يَومَ القِيَامَة لا حُجَّةَ لَهُ.))

جو کوئی اطاعت سے دستبردار ہوا، تو وہ اللہ تعالیٰ سے قیامت کے دن یوں ملے گا کہ اس کے پاس اپنے اس عمل کی کوئی دلیل نہیں ہوگی (مسلم)

خلیفہ کی بیعت کی پامالی کرنا اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے اپنا ہاتھ کھینچ لینے کے مترادف ہوتی ہے۔ اگر خلیفہ کو بیعتِ انعقاد دی گئی ہو یا اطاعت کی بیعت کی گئی ہو اور وہ اُس کے ذریعہ خلیفہ بن گیا ہو تو اب اس بیعت سے دستبرداری ممکن نہیں، البتہ اگر معاملہ یہ ہو کہ ایک شخص ہونے والے خلیفہ کو بیعت ابتداء میں دے لیکن پھر اُس خلیفہ کی خلافت کا انعقاد نہ ہوسکے تو یہ جائز ہے کہ بیعت دینے والا اُس بیعت سے آزاد ہوجائے، کیونکہ اُس خلیفہ کو مسلمانوں کی جانب سے بیعت پوری نہیں ہو پائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں خلیفہ کی بیعت سے رجوع کرنے سے منع کیا گیا ہے نہ کہ کسی بھی آدمی کی بیعت سے جو بہرحال خلیفہ نہ بن سکا۔

وحدتِ خلافت:

یہ بات مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ایک ہی ملک میں رہیں اور اُن کا ایک ہی خلیفہ ہو نہ کہ ایک سے زیادہ؛ اور یہ شرعاً حرام ہے کہ مسلمانوں کے ایک سے زیادہ ملک ہوں یا اُن پر ایک سے زیادہ خلیفہ ہوں۔

اسی طرح مسلمانوں پر یہ بھی فرض ہے کہ اُن کی ریاستِ خلافت میں حکومت کا نظام وحدت پر مبنی ہو نہ کہ وفاقی (Federal)، کیونکہ مسلم نے عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((...ومن بايع اماماً فأعطاه صفقة يده، و ثمرة قلبه، فليطعه إن إستطاع. فإن جاء آخر ينازعه فاضربوه عنق الآخر))

''جو کوئی ایک امام کے ہاتھ پر صدقِ دل سے بیعت دے دے، پس اسے چاہئے کہ وہ حسبِ استطاعت اسکی اطاعت کرے، اور اگر کوئی دوسرا آ کر خلیفہ سے تنازعہ کرے، تو اسکی گردن اُڑا دو''

اس کے علاوہ مسلم نے عرفجہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((من أتاكم و أمرُكم جميعٌ على رجلٌ واحد، يريد أن يشق عصاكم، أو يفرّق جماعتكم، فأقتلوه))

''جب تمہارے معاملات ایک شخص پر مجتمع ہوں، اور کوئی شخص تمہارے پاس آ کر تمہاری وحدت کو توڑنے یا تمہاری جماعت میں تفریق پیدا کرنے کی کوشش کرے، تو اُسے قتل کر دو''

نیز مسلم نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((إذا بُويع لخليفتين فأقتلوا الآخر منهما))

''اگر دو خلفاء کی بیعت ہو جائے تو دوسرے کو قتل کر دو''

اسی طرح مسلم نے ابوحازم کی روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں پانچ سال ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہا اور میں نے اُن سے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((كانت بنو إسرائيل تسوسهم الأنبياء ، كلما هلك نبي خلفه نبي، وإنه لا نبي بعدي ، وستكون خلفاء فتكثر ، قالوا: فما تأمرنا؟ قال: فُوا ببيعة

الأول فالأول، وأعطوهم حقهم، فإن اللّٰه سائلهم عما استرعاهم))

''بنی اسرائیل کی سیاست (امور کی دیکھ بھال) انبیاء کیا کرتے تھے۔ جب کوئی نبی وفات پاتا تو دوسرا نبی اس کی جگہ لے لیتا جبکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے، بلکہ بڑی کثرت سے خلفاء ہوں گے۔ صحابہ نے پوچھا: آپ ﷺ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم ایک کے بعد دوسرے کی بیعت کو پورا کرو اور ان کا حق انہیں ادا کرو۔ جبکہ اللہ تعالیٰ اُن سے ان کی رعیت کے بارے میں پوچھے گا جو اُس نے انہیں دی''

لہٰذا پہلی حدیث سے یہ واضح ہوا کہ جب کسی کی امامت یا خلافت طے ہو جائے تو اُس کی اطاعت فرض ہو جاتی ہے اور ایسے میں اگر کوئی دوسرا شخص آ کر اُس کی خلافت کے متعلق تنازعہ کرے اور اپنے اِس تنازعہ سے رجوع نہ کرے تو اُس سے لڑنا اور اسے قتل کر دینا واجب ہو جاتا ہے۔

دوسری حدیث یہ بیان کرتی ہے کہ جب مسلمان ایک خلیفہ کی امارت تلے ایک جماعت کی شکل میں اکٹھے ہو چکے ہوں، اور کوئی شخص آ کر اس وحدت میں رخنہ اور جماعت میں پھوٹ ڈالے تو اُس کا قتل کر دیا جانا فرض ہوتا ہے۔ ان دونوں احادیث میں یہ مفہوم موجود ہے کہ مسلمانوں کی ریاست کے حصے بخرے کرنا منع ہے اور یہ تاکید کی گئی ہے کہ اس وحدت و ریاست کی تقسیم کی معافی نہیں ہے، یہ بات ممنوع ہے چاہے اس تقسیم کو تلوار کے زور سے ہی روکنا پڑے۔

تیسری حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ ریاست میں خلیفہ کے؛ موت کے سبب، اسے معزول کئے جانے کی وجہ سے، یا پھر خود اُس کے ہٹ جانے کے باعث، اگر دو اشخاص پر بیعت ہو جاتی ہے تو اُس دوسرے شخص کو قتل کر دیا جائے، یعنی خلیفہ وہ ہوگا جسے پہلے صحیح بیعت دے دی گئی ہو اور دوسرے شخص کو، اگر وہ خلافت کے دعوے سے دستبردار نہیں ہوتا، قتل کر دیا جائے۔ لہٰذا یہ اور بھی اولیٰ ہوا کہ اگر دو سے زیادہ پر بیعت ہو جائے تو پہلے شخص کے ماسوا دیگر تمام کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جائے۔ یہ ریاست کے ایک سے زیادہ ہونے کی ممانعت کیلئے کنایہ ہے۔ یعنی یہ حرام ہے

کہ مسلمانوں کی ریاست کو تقسیم کر کے کئی ریاستیں بنا دی جائیں بلکہ یہ لازمی ہے کہ مسلمانوں کی ریاست ایک ہی رہے۔

چوتھی حدیث اس بات کیلئے ثبوت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کثیر تعداد میں خلفاء ہوں گے اور صحابہ کرام ؓ نے جب دریافت کیا کہ جب بہت سے خلفاء ہوں گے تو ہم کیا کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو سب سے پہلے بیعت دی گئی ہو اُس سے اپنی بیعت کا ایفاء کرو۔ کیونکہ وہی شرعی خلیفہ ہے اور اطاعت صرف اس ہی کی کی جاسکتی ہے نہ کہ باقیوں کی، جن کی بیعت باطل اور غیر شرعی ہوگی۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے ایک خلیفہ کی موجودگی میں دوسرے کو بیعت دینا جائز ہی نہیں ہے۔ یہ حدیث بھی ایک ہی خلیفہ کی اطاعت کی فرضیت کیلئے دلیل ہے ،اور یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ مسلمانوں کیلئے یہ جائز نہیں کہ اُن کے ایک سے زیادہ خلیفہ ہوں یا مسلمانوں کی ایک سے زیادہ ریاستیں ہو۔

خلیفہ کے اختیارات:

خلیفہ کو مندرجہ ذیل اختیارات حاصل ہوتے ہیں:

1) خلیفہ ہی امت کے معاملات کی نگہداشت کیلئے ضروری شرعی احکام کی تبنی کرتا ہے جو قرآن اور سنتِ رسول ﷺ سے صحیح اجتہاد کے ذریعہ مستنبط کئے گئے ہوں۔ یہ تبنی شدہ احکام قانون بن جاتے ہیں جن کی اطاعت فرض ہو جاتی ہے اور اُن کے مخالف کرنا جائز نہیں ہوتا۔

2) خلیفہ ہی ریاست کی داخلہ و خارجہ پالیسی کا ذمہ دار ہوتا ہے، وہی فوج کا قائد ہوتا ہے۔ خلیفہ ہی جنگ کا اعلان کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور وہی صلح و جنگ بندی نیز دیگر معاہدے کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔

3) خلیفہ ہی بیرونی ممالک کے سفیروں کو قبول یا مسترد کرتا ہے اور وہی مسلمان سفیر مقرر کرتا ہے یا اُنہیں برخواست کرتا ہے۔

4) خلیفہ ہی اپنے لیے معاونین اور مختلف والیوں کو مقرر کرتا ہے اور وہی انہیں برخواست کرتا ہے؛ یہ سب خلیفہ اور مجلسِ امت (مجلس شوریٰ) کو جوابدہ ہوتے ہیں۔

5) خلیفہ ہی قاضی القضاء اور دیگر قاضیوں کو مقرر اور انہیں برخواست کرتا ہے؛ البتہ قاضیٔ مظالم کو وہ صرف مقرر کر سکتا ہے۔ قاضیٔ مظالم کو برخواست کرنے میں اُس پر بعض پابندیوں کا اطلاق ہوتا ہے جو عدلیہ کے باب میں اپنے مقام پر بیان کی گئی ہیں۔ خلیفہ ہی مختلف محکموں کے سربراہان کو مقرر اور برطرف کرتا ہے۔ وہ فوج کے قائد، اُس کی شاخوں اور لواء (بریگیڈز) کے کمانڈروں کو مقرر اور معزول کرتا ہے۔ یہ تمام خلیفہ ہی کو جوابدہ ہوتے ہیں نہ کہ مجلس امت کو۔

6) خلیفہ ہی ایسے شرعی احکام کی تبنی کرتا ہے جن کی رو سے ریاست کا میزانیہ (بجٹ) کیا جاتا ہے، وہی اس بجٹ کی مختلف مَدیں طے کرتا ہے اور ہر مد کیلئے رقوم طے کرتا ہے، خواہ یہ آمدنی سے متعلق ہوں یا اخراجات سے۔

مذکورہ چھ اختیارات کیلئے تفصیلی دلائل یہ ہیں:

پہلے اختیار کی دلیل صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ قانون یا دستور ایک اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں وہ حکم جو حکومت عوام پر منطبق کرنے کیلئے صادر کرے، قانون کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ: قانون ایسے احکامات کا مجموعہ ہے جنہیں حکومت عوام پر لازم کرتی ہے کہ وہ اپنے معاملات میں ان پر عمل کریں۔ یعنی جب حکومت کسی معین احکامات کو صادر کرے تو یہ قانون بن جاتے ہیں اور عوام اِن کے پابند ہوتے ہیں اور اگر حکومت اِن کا حکم نہ دے تو یہ قانون نہیں ہوتے اور نہ ہی عوام اِن کے پابند ہوتے ہیں۔ تاہم چونکہ مسلمان شریعت کے پابند ہوتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی پر چلتے ہیں نہ کہ وہ حکومت کے احکامات کی محض احکامات ہونے کے ناطے پابندی کرتے ہیں؛ پس مسلمان جس چیز کے پابند ہیں وہ شریعت کے احکامات ہیں نہ کہ حکومت کے احکامات۔ تاہم ایسا ہوا کہ شرعی احکامات کے بارے میں صحابہ کرام ﷺ کی رائے ایک دوسرے سے مختلف تھی کیونکہ شرعی نصوص کے بارے میں ایک صحابی کا فہم یا ادراک دوسرے صحابہ کے فہم سے

مختلف تھا، ہر ایک اپنے فہم کے مطابق عمل کرتا تھا اور وہی اُس کیلئے اللہ کا حکم ہوتا تھا۔ لیکن امت کے معاملات کی دیکھ بھال اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ بعض شرعی احکامات میں تمام مسلمان اجتماعی طور پر ایک ہی رائے کے پابند ہوں نہ کہ ہر ایک اپنے اپنے اجتہاد پر عمل کرے۔ اور ایسا عملی طور پر ہوا، جیسا کہ ابو بکر صدّیق ﷺ کی رائے تھی کہ مال تمام مسلمانوں میں برابر برابر تقسیم کیا جائے کیونکہ وہ اس مال میں برابر کے حقدار ہیں؛ اس کے برعکس عمر ﷺ کی رائے یہ تھی کہ وہ لوگ جو اب مسلمان ہو چکے ہیں لیکن وہ اس سے قبل رسول اللہ ﷺ کے خلاف جنگ کرتے تھے، اُن کا حق بہر حال اُن لوگوں کے برابر نہیں ہوسکتا جو آپ ﷺ کے ساتھ مل کر قتال کیا کرتے تھے؛ اور وہ اس بات کو بھی درست نہیں سمجھتے تھے کہ دولتمند کو مسکین فقیر کے برابر دیا جائے، لیکن ابو بکر ﷺ مسلمانوں کے خلیفہ تھے اور اُنہوں نے اپنی رائے پر عمل درآمد کا حکم دیا یعنی یہ قانون اختیار کیا کہ مال کی تقسیم برابری سے کی جائے۔ اور مسلمان اسی پر چلے اور والیوں اور قاضیوں نے اسی حکم پر عمل کیا۔ عمر ﷺ بھی اسی رائے کے پابند رہے، اور انہوں نے بھی اسی پر عمل کیا اور اسی کو نافذ کیا۔ لیکن جب عمر ﷺ خود خلیفہ بنے تو اُنہوں نے ابو بکر ﷺ کی رائے کے خلاف حکم اختیار کیا، یعنی یہ کہ مال کی تقسیم میں افضلیت یا مراتب ملحوظ رکھے جائیں نہ کہ اسے برابری سے تقسیم کیا جائے۔ چنانچہ اب مال تقسیم کرنے میں کسی شخص کی ضروریات اور اُس کے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی رعایت رکھی جانے لگی اور قاضیوں اور والیوں نے اسی پر عمل کیا۔ لہٰذا یہ اس بات پر صحابہ کرام کا اجماع ٹھہرا کہ امام یا خلیفہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ صحیح اجتہاد کے ذریعے شریعت سے اخذ کردہ معیّن احکامات کو اختیار کرے اور اُن ہی کے مطابق عمل کا حکم دے جس کی اطاعت مسلمانوں پر واجب ہوگی گو کہ لوگوں کا اجتہاد اس کے برعکس ہو لیکن وہ اپنی رائے اور اپنے اجتہاد کو ترک کر کے اسی پر عمل کریں۔ ایسے تبنّی شدہ احکامات ہی قوانین ہوتے ہیں، لہٰذا قوانین وضع کرنا صرف خلیفہ ہی کا اختیار اور اسی کی ذمہ داری ہے اور اُس کے سوا یہ اختیار مطلقاً کسی کو حاصل نہیں ہوتا۔

خلیفہ کے دوسرے اختیار کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے، آپ ﷺ خود قاضیوں اور والیوں کو مقرر فرماتے تھے اور اُن کا محاسبہ کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ خود خرید و فروخت پر نظر رکھتے

اور دھوکہ دہی کو روکتے تھے۔ آپ ﷺ خود مال کو تقسیم فرماتے اور بے روزگار کیلئے روزگار مہیا کرنے کا سامان کرتے تھے۔ نیز آپ ﷺ خود ریاست کے تمام داخلی امور کی نگہداشت فرماتے تھے۔ بیرونی ممالک کے بادشاہوں کو خطاب بھی آپ ﷺ خود کرتے اور آپ ﷺ باہر سے آنے والے وفود سے ملاقات کرتے تھے، نیز ریاست کے جملہ خارجی امور کی دیکھ بھال فرماتے تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ عملاً فوج کے قائد بھی تھے اور آپ ﷺ غزوات میں معرکوں کی قیادت سنبھالتے تھے؛ نیز فوجی مہمات کیلئے فوجی دستوں کے سالار آپ ﷺ خود مقرر فرماتے اور اُنہیں مہم پر بھیجتے تھے۔ حتیٰ کہ جب آپ ﷺ نے شام کی ایک مہم کیلئے اُسامہ ابن زید ؓ کو امیر مقرر فرمایا تو اُن کی عمر کم ہونے کے سبب یہ بعض صحابہ کو ناگوار گزرا لیکن آپ ﷺ مُصِر رہے کہ اسامہ کی قیادت کو ہی قبول کیا جائے۔ یہ اِس بات کی دلیل ٹھہری کہ خلیفہ ہی حقیقتاً فوج کا قائد اعلیٰ ہوتا ہے نہ کہ محض برائے نام قائد۔ اس کے علاوہ خود آپ ﷺ نے قریش کے خلاف اور پھر بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع اور خیبر و روم کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ غرض یہ کہ جو بھی جنگ واقع ہوئی اُس کیلئے اعلانِ جنگ خود آپ ﷺ نے ہی فرمایا، جو اس بات کی دلیل ہوئی کہ خلیفہ ہی کو اعلانِ جنگ کا اختیار ہے۔ مزید یہ کہ یہودیوں کے ساتھ اور بنی مدلج نیز اُن کے حلیف بنی ضمرۃ کے ساتھ معاہدات بھی خود آپ ﷺ نے کئے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ایلہ کے یوحنہ بن رؤبہ سے معاہدہ کیا۔ اس کے علاوہ حدیبیہ کا معاہدہ بھی خود آپ ﷺ نے کیا جس پر مسلمان ناخوش تھے لیکن آپ ﷺ نے کسی کی بات قبول نہیں کی اور اُن کے مشورے ٹھکرا کر معاہدہ طے کر لیا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ صرف خلیفہ ہی صلح اور دیگر معاہدے کرنے کا مجاز ہے۔

خلیفہ کے تیسرے اختیار کی دلیل یہ ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نے مسیلمہ کذاب کے نامہ بروں نیز قریش کے نامہ بر رافع سے ملاقات کی اور آپ ﷺ نے ہی ہرقل، کسریٰ، مقوقس، حیرہ کے بادشاہ حارث الغسّانی، یمن کے بادشاہ حارث الحِمیَری اور حبشہ کے نجاشی کی طرف اپنے نامہ بر بھیجے۔ نیز عثمان بن عفان ؓ کو حدیبیہ کے موقع پر قریش کی جانب اپنا پیغام بر بنا کر روانہ کیا۔ یہ اِس بات کی دلیل ہے کہ خلیفہ ہی سفیروں کو قبول یا مسترد کرتا ہے اور وہی سفیروں کو مقرر کرنے کا مجاز

ہوتا ہے۔

خلیفہ کے چوتھے اختیار کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ خود والیوں کو مقرر فرماتے تھے چنانچہ آپ ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا والی مقرر فرمایا۔ والیوں کو برطرف بھی آپ ﷺ خود ہی کیا کرتے تھے چنانچہ علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے لوگوں کی شکایت کی وجہ سے برطرف فرما دیا، جو اس بات کی بھی دلیل ٹھہری کہ والی اپنے خطہ کے لوگوں کو بھی جوابدہ ہوتا ہے جیسے کہ وہ خلیفہ اور مجلس امت کو جوابدہ ہوتا ہے، جو تمام ولایات کی نمائندگی کرتی ہے۔ رہی بات معاونین کی، تو آپ ﷺ کے دو معاون تھے: ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ، جنہیں آپ ﷺ نے تمام عمر نہ تو معزول فرمایا اور نہ ہی کسی اور کو معاون بنایا۔ جب تک کوئی معاون رہے اِس کے اختیارات خلیفہ ہی کے جانب سے ہوتے ہیں اور معاون خلیفہ کے نائب کی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ خلیفہ کو اپنا نائب برطرف کرنے کا اختیار حاصل ہوتا ہے، جیسے کسی بھی مؤکل کو اپنا وکیل برطرف کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

خلیفہ کے پانچویں اختیار کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو یمن میں قاضی مقرر فرمایا تھا۔ مسند احمد میں عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس دو اشخاص آئے جن کے درمیان کوئی تنازعہ تھا، رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن العاص سے فرمایا: ((**أقض بينهما يا عمرو**)) ''اے عمرو! اِن کے درمیان فیصلہ کرو''۔ عمرو بن العاص نے جواب دیا: ''آپ ﷺ مجھ سے بہتر ہیں'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پھر بھی''، عمرو بن العاص نے سوال کیا کہ اگر میں اِن کے درمیان فیصلہ کر دوں تو میرے لیے کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((**إن أنت قضيتَ بينهما فأصبتَ القضاء فلك عشر حسنات. وإن أنت اجتهدت فأخطأت فلك حسنة**))

''اگر تم نے صحیح فیصلہ کیا تو تمہیں دس نیکیاں ملیں گی اور اگر تم نے اجتہاد میں خطا بھی کی تو ایک نیکی''

عمر رضی اللہ عنہ، قاضیوں کو مقرر فرماتے تھے، چنانچہ آپؓ نے کوفہ میں شریح کو قاضی مقرر کیا اور ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا قاضی بنایا۔ نیز شرحبیل بن حسنہ کو شام کے والی کے عہدے سے معزول

کر کے معاویہ کو والی بنایا۔ جب شرحبیل بن حسنہ نے دریافت کیا کہ کیا آپ ﷺ نے مجھے بزدل ہونے یا خیانت کرنے کی وجہ سے معزول کیا ہے؟ تو عمر ﷺ نے فرمایا: (**من کلٍّ لا، ولکن أردت رجلاً أقوی من رجل**) ''یہ دونوں وجوہات نہیں، بلکہ صرف یہ کہ میں زیادہ مضبوط شخص چاہتا تھا''۔ اسی طرح علی ﷺ نے ابوالاسود کو والی مقرر فرمایا اور پھر اسے معزول کر دیا، لہٰذا اس نے دریافت کیا کہ آپ نے مجھے کیوں برطرف کیا؟ نہ تو میں نے خیانت کی ہے اور نہ ہی کوئی جرم۔ علی ﷺ نے فرمایا: (**إني رأیتك یعلو کلامك علی الخصمین**) ''میں نے تمہیں دو فریقین سے اونچی آواز میں بات کرتے دیکھا تھا''

عمر ﷺ اور علی ﷺ کے یہ افعال تمام صحابہ کے عین سامنے ہوئے اور کسی نے بھی اِن سے انکار نہیں کیا۔ یہ تمام دلیل ٹھہرا کہ خلیفہ ہی کو قاضی کو مقرر کرنے کا اختیار رکھتا ہے، نیز اسے یہ بھی اختیار ہوتا ہے کہ وہ کسی اور کو قاضیوں کی تقرری کیلئے اپنا نائب مقرر کر دے، جیسا کہ وکیل بنانے میں ہوتا ہے۔ اس بنا پر خلیفہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے تمام اختیارات اور تصرفات میں سے کسی اختیار یا تصرف کیلئے کسی کو اپنا وکیل یا نائب مقرر کر دے۔

جہاں تک قاضیٔ مظالم کو برطرف کرنے کے استثناء کا معاملہ ہے، تو یہ استثناء اُس حالت میں ہوتا ہے کہ قاضیٔ مظالم کے روبرو فیصلے کے لیے کوئی ایسا مقدمہ یا معاملہ موجود ہو جو خلیفہ کے خلاف ہو یا اُس کے معاونین یا پھر قاضیٔ القضاۃ کے خلاف ہو۔ اِس استثناء کی بنیاد یہ شرعی قاعدہ ہے کہ: (**الوسیلة إلی الحرام حرامٌ**) ''حرام کی طرف لے جانے کا ذریعہ بھی حرام ہوتا ہے''۔ کیونکہ اگر ایسی صورت میں بھی خلیفہ کو قاضیٔ مظالم کو برطرف کرنے کا اختیار حاصل رہے تو یہ اختیار قاضیٔ مظالم کے حکم پر اثر انداز ہوگا، اور یوں شرعی حکم لاگو نہیں ہو سکے گا، اور ایسا ہونا حرام ہے۔ پس ایسی حالت میں قاضیٔ مظالم کو برطرف کرنے کے اختیار کا خلیفہ کے پاس ہونا حرام کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ اس قاعدے کے رو سے قطعیت کی بجائے محض غالب گمان کا ہونا ہی کافی ہے۔ لہٰذا ایسی حالت میں قاضیٔ مظالم کی برطرفی کا اختیار محکمۂ مظالم کے پاس ہوتا ہے۔ البتہ اگر صورتِ حال یہ نہ ہو تو پھر حکم اپنے اصل مقام پر ہی باقی رہے گا، یعنی خلیفہ ہی قاضی مظالم کو

مقرر یا معزول کرسکتا ہے۔

جہاں تک مختلف محکمات کے سربراہان کے تقرر کا تعلق ہے تو رسول اللہ ﷺ نے ریاست کے انتظام کے لیے ہر معاملے کیلئے کاتب مقرر فرمائے تھے جن کی حیثیت اپنے اپنے محکموں کے مدیر (ڈائریکٹرز) کی ہوتی تھی، چنانچہ معیقیب بن ابی فاطمہ الدوسی رضی اللہ عنہ مہر نبوت پر ذمہ دار تھے اور انہیں مالِ غنیمت کی ذمہ داری بھی سونپی گئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو علاقہ حجاز کے پھلوں کی پیداوار کے تخمینہ کی ذمہ داری سونپی تھی۔ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ صدقات کا حساب لکھیں۔ مغیرۃ بن شعبۃ رضی اللہ عنہ قرضہ جات اور معاملات کو قلم بند کیا کرتے تھے اور اسی طرح دیگر معاملات بھی تھے۔

پھر فوج کے قائدین (جرنیلوں) اور لواء کے امیروں (بریگیڈیئروں) کو بھی رسول اللہ ﷺ ہی مقرر فرماتے تھے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کو تیس افراد کے ایک دستے پر امیر بنا کر قریش سے تعرض کیلئے سمندر کے ساحل کی جانب روانہ کیا؛ نیز آپ ﷺ عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کو ساٹھ آدمیوں کے دستے کی امارت سونپی اور قریش سے ٹکراؤ کیلئے رابغ کے مقام پر بھیجا۔ اسی طرح سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو بیس اشخاص پر امیر بنا کر مکہ کی جانب روانہ فرمایا۔ گویا آپ ﷺ فوج کے قائد اور لواء کے امیر مقرر فرمایا کرتے تھے، چنانچہ یہ اس بات کی دلیل ہوئی کہ خلیفہ ہی فوج کے قائد اور لواء کے امیر مقرر کرنے کا مجاز ہے۔

یہ تمام رسول اللہ ﷺ کو جوابدہ ہوتے تھے اور کسی دوسرے کے سامنے جوابدہ نہ تھے۔ یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ قاضی، محکموں کے سربراہان، فوج کے قائدین (Generals)، فوجی ٹکڑیوں (بریگیڈز) کے امیر، نیز تمام ملازمین خلیفہ کے سوا کسی اور کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتے، پس وہ مجلسِ امت کے سامنے بھی جواب دہ نہیں ہوتے۔ مجلسِ امت جوابدہی کیلئے صرف معاونین، والیوں اور شہروں کے عاملین کو ہی طلب کرسکتی ہے، کیونکہ یہ سب حکمران ہیں۔ اِن کے علاوہ دیگر عہدیدار مجلسِ امت کو جوابدہ نہیں ہوتے بلکہ خلیفہ ہی کو

جوابدہ ہوتے ہیں۔

جہاں تک خلیفہ کے چھٹے اختیار کا تعلق ہے، تو ریاست کے بجٹ میں آمدنی اور اخراجات کے ابواب شرعی احکام کے پابند ہوتے ہیں؛ نہ تو ایک دینار بھی بغیر حکم شرعی کے ان میں داخل کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ایک دینار بھی حکمِ شرعی کے خلاف خرچ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ مصارف کی تفصیلات یا جنہیں بجٹ کی مختلف مَدیں کہا جا سکتا ہے وہ خلیفہ کی رائے اور اُس کے اجتہاد کے تابع ہوتی ہیں اور اسی طرح آمدنی کی تفصیلات بھی اُس کے اجتہاد کے تابع ہوتی ہیں۔ مثلاً خلیفہ ہی طے کرتا ہے کہ خراج کی زمین پر کس مقدار میں خراج عائد کیا جائے؟ یا یہ کہ جزیہ کی رقم کیا ہو؟ یہ اور اِن جیسی مثالیں آمدنی کی مختلف مَدوں کی تفصیل کے ضمن میں آتی ہیں۔ یا خلیفہ ہی مثلاً یہ طے کرتا ہے کہ سڑکوں پر کس قدر خرچ کیا جائے یا ہسپتالوں پر کتنا خرچ کیا جائے؟ یہ اخراجات کی تفصیلات ہیں جنہیں خلیفہ طے کرتا ہے اور یہ اُس کی اپنی صوابدید اور اجتہاد پر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ بذاتِ خود عمال سے اموال وصول کیا کرتے تھے اور اخراجات بھی آپ ﷺ ہی کی نگرانی میں ہوتے تھے۔ بعض والیوں کو آپ ﷺ نے یہ تصرف بھی دیا کہ وہ مال وصول کریں اور اُسے خرچ کریں جیسا کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا جب آپ ﷺ نے اُنہیں یمن کا والی مقرر کیا تھا۔ اسی طرز پر خلفائے راشدین کا بھی عمل رہا اور وہ اموال کی وصولی نیز اُس کا تصرف، خلیفہ ہونے کی حیثیت سے، اپنی رائے اور اجتہاد سے کرتے تھے اور اُن کے اِس عمل پر کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ خلیفہ کی اجازت یا رائے کے خلاف ایک بھی دینار نہ وصول کیا جاتا تھا اور نہ ہی خرچ ہوتا تھا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے جب معاویہ کو ولایت عامہ سونپی تھی تو یہی معاملہ تھا، وہی مال وصول کرتے اور خرچ کیا کرتے تھے۔ یہ سب اس پر دلالت کرتا ہے کہ خلیفہ یا خلیفہ کا مقرر کردہ نائب ہی ریاست کے بجٹ کی مختلف مَدیں طے کرتا ہے۔

خلیفہ کے اختیارات کے متعلق مندرجہ بالا تفصیلی دلائل بیان کیے گئے۔ مزید برآں اِن تمام اختیارات کیلئے ایک مجموعی دلیل وہ بھی ہے جو بخاری اور مسند احمد میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((الإمام راع و مسؤول عن رعيته))

''امام یعنی خلیفہ اپنے عوام کا نگہبان اور اُن کا ذمہ دار ہوتا ہے''

یعنی رعایا کے معاملات سے متعلق تمام امور خلیفہ ہی کی ذمہ داری ہوتے ہیں، نیز وکالت کے قائدے کی بنیاد پر خلیفہ کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اُن امور میں سے جن کیلئے جس کسی کو جیسے مناسب سمجھے اپنا نائب مقرر کرسکتا ہے۔

خلیفہ احکامات کی تبنّی کرنے میں شریعت کا پابند ہوتا ہے:

خلیفہ احکامات کی تبنی کرنے یعنی قوانین کو اختیار کرنے میں شریعت کا پابند ہوتا ہے۔ خلیفہ کیلئے حرام ہے کہ وہ شرعی دلائل سے صحیح استنباط کیے بغیر کوئی حکم تبنی کرے۔ وہ اپنے تبنی شدہ احکام کا بھی پابند ہوتا ہے اور اپنے طریقۂ استنباط کا بھی پابند ہوتا ہے، لہٰذا اُس کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے طریقۂ استنباط سے متضاد کسی اور طریقے سے کوئی حکم مستنبط کرے یا اپنے تبنی شدہ احکام کے خلاف کوئی حکم جاری کرے۔ پس خلیفہ کے لیے مندرجہ بالا دونوں امور کی پابندی کرنا لازم ہوتا ہے۔

اس قائدے کی دلیل کہ خلیفہ احکامات کی تبنی میں شریعت کا پابند ہوتا ہے، حسبِ ذیل ہے:

1) سب سے پہلے تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان، خواہ وہ خلیفہ ہو یا کوئی اور شخص، پر یہ فرض کیا ہے کہ وہ اپنے تمام اعمال وافعال شرع کے حکم کے مطابق انجام دے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾

''(اے محمد ﷺ) آپ کے رب کی قسم! یہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک یہ آپ ﷺ کو اپنے باہمی اختلافات میں فیصلہ کرنے والا نہ بنالیں'' (النساء: 65)

اعمال وافعال کا حکمِ شرعی کے موافق ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ جہاں کہیں شارع کے خطاب کے ایک سے زیادہ مفہوم ممکن ہوں یعنی ایک سے زیادہ حکمِ شرعی نکل سکتے ہوں،

وہاں ایک مخصوص و معین حکم تبنی کیا جائے۔ لہٰذا ایک مسلمان کیلئے یہ واجب ہے کہ جہاں حکمِ شرعی کے فہم مختلف ہوں وہ اپنا عمل انجام دیتے وقت اُن میں ایک حکم اختیار کر لے، یہی خلیفہ پر واجب ہے، جب وہ حکمرانی کا فعل سرانجام دینے کا ارادہ کرے۔

2) جو بیعت خلیفہ کو دی جاتی ہے، اُس کے الفاظ سے ہی خلیفہ اس بات کا پابند ہو جاتا ہے کہ وہ شریعتِ اسلامی کا التزام کرے۔ یہ بیعت اسے کتاب اللہ اور سنتِ رسول پر دی جاتی ہے، پس اُس کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ ان سے روگردانی کرے۔ بلکہ اگر وہ اسلام کے علاوہ کسی اور قانون پر یقین رکھتے ہوئے قرآن وسنت سے رُوگردانی کرتا ہے تو وہ کفر کا مرتکب ہو جاتا ہے، نیز اگر وہ اسلام کے علاوہ کسی اور قانون پر یقین نہ بھی رکھے مگر قرآن وسنت سے رُوگردانی کرے، تو بھی وہ گنہگار، ظالم اور فاسق ہو جاتا ہے۔

3) خلیفہ کو مقرر کرنے کا مقصد ہی شریعت کو نافذ کرنا ہے، لہٰذا خلیفہ کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ مسلمانوں پر نافذ کرنے کیلئے شریعت کے سوا کہیں اور سے حکم اخذ کرے کیونکہ شریعت نے اس بات کو حتمی طور پر ممنوع قرار دیا ہے۔ اور اسلام کے سوا کسی اور قانون کے ذریعے حکمرانی کرنے کو ایمان کی نفی بتایا ہے، جو اس ممانعت کے قطعی ہونے کا قرینہ (اشارہ) ہے۔ یعنی خلیفہ قوانین تبنی کرنے یا اُنہیں وضع کرنے میں صرف شریعت کا ہی پابند ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر وہ شریعت کے احکام کے ماسوا کوئی اور قانون اختیار کرتا ہے اور اُن قوانین پر اُس کا ایمان بھی ہوتا ہے تو وہ کفر کا مرتکب ہوگا اور اگر وہ ایسے قانون تو وضع کرتا ہے لیکن اُن پر اُس کا ایمان نہیں ہوتا تو بھی وہ گنہگار، ظالم اور فاسق ضرور ہوگا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ خلیفہ اپنے تبنی (اختیار) کردہ قوانین اور اس طریقۂ استنباط کا پابند ہوتا ہے کہ جس کے ذریعے یہ قانون اخذ کیا گیا، تو اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ حکمِ شرعی جو خلیفہ نافذ کرتا ہے وہ اُس کے حق میں شریعت کا حکم ہوتا ہے، نہ کہ کسی اور کیلئے۔ یعنی یہ وہ شرعی حکم ہے جو اعمال وافعال کو اُس کے موافق چلانے کیلئے تبنی کیا گیا، اور یہ کوئی سا بھی شرعی حکم نہیں۔ لہٰذا

خلیفہ جب کوئی شرعی حکم استنباط کرے یا کسی حکم کی تقلید کرے، تو وہ حکم اُس کے حق میں اللہ کا حکم ہوتا ہے پس وہ اسی حکم کو مسلمانوں کیلئے تبنی کرنے کا پابند ہوتا ہے اور اُس کیلئے اس حکم کے خلاف تبنی کرنا جائز نہیں ہوتا، کیونکہ وہ اُس کے حق میں اللہ کا حکم نہیں ہوتا یعنی شریعت کا حکم نہیں ہوتا چنانچہ وہ مسلمانوں کیلئے بھی شریعت کا حکم نہیں رہ جاتا۔ لہٰذا خلیفہ عوام کیلئے جاری کرنے والے قوانین میں اسی شرعی حکم کا پابند ہوتا ہے جو اُس نے تبنی کیا ہو۔ اب اُس کیلئے یہ جائز نہیں رہا کہ وہ اُس تبنی شدہ حکم کے خلاف حکم جاری کرے؛ کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو گویا اُس نے شرعی حکم کے خلاف حکم جاری کیا۔ چنانچہ خلیفہ کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے تبنی شدہ احکام کے خلاف کوئی حکم جاری کرے۔

مزید یہ کہ خلیفہ کے استنباط کے طریقہ کی تبدیلی سے حکمِ شرعی کا فہم بھی تبدیل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر خلیفہ کسی حکم کی علت جو نصوص شریعت میں وارد ہے کو ہی شرعی علت تسلیم کرتا ہے اور مصلحت کو علت یا مصالح المرسلہ کو شرعی دلیل نہیں سمجھتا، تو اُس نے اپنے لئے استنباط کا طریقہ متعیّن کر لیا اور اب خلیفہ اسی طریقہ کا پابند ہو گیا؛ اب یہ اُس کیلئے جائز نہیں کہ وہ کوئی ایسا شرعی حکم تبنی کرے جس کی دلیل مصالح المرسلہ کی بنیاد پر مبنی ہو، یا کسی ایسی علت کی بنا پر قیاس کرے جو شرعی نصوص میں وارد نہ ہوئی ہو؛ کیونکہ ایسا حکم اُس کے حق میں حکم شرعی نہیں ہوتا اس لئے کہ اُس کے نزدیک اس حکم کی دلیل شرعی نہیں ہے، لہٰذا ایسا حکم اُس کی نظر میں شرعی حکم نہیں ہوگا۔ اور جب وہ خود اس کو شرعی حکم تسلیم نہیں کرتا تو یہ مسلمانوں کے حق میں بھی حکمِ شرعی نہیں ہوگا۔ یہ حکم ایسا ہوگا گویا خلیفہ نے شرعی احکام کے ماسوا حکم تبنی کیا ہو، جو کہ اُس کیلئے حرام ہے۔ اس کے برعکس اگر خلیفہ محض مقلد ہے یا صرف مجتہدِ مسئلہ ہے نہ کہ مجتہدِ مذہب یا مجتہدِ مطلق جن کا اپنا متعین طریقہ استنباط ہوتا ہے؛ تو ایسی صورت میں اس کی تبنی اُس مجتہد کے اجتہاد پر مبنی ہوتی ہے جس کی وہ تقلید کرتا ہے، یا اس کی تبنی اپنے اجتہاد پر مبنی ہوتی ہے اگر وہ خود مجتہدِ مسئلہ ہے، جس کیلئے اس کے پاس دلیل یا شبهة الدليل موجود ہے؛ تو ایسی صورت میں خلیفہ اپنے صادر کردہ احکامات کا پابند ہوگا، اس انداز میں کہ وہ کوئی ایسا حکم جاری نہیں کرے گا جو اُس کے اپنے تبنی شدہ احکامات کے خلاف ہو۔

ریاستِ خلافت ایک انسانی ریاست ہوتی ہے نہ کہ ریاستِ الٰہیہ:

خلافت ہی اسلامی ریاست ہوتی ہے جو دنیا میں تمام مسلمانوں کے لیے امارتِ عامہ ہے۔ جب کسی بھی مسلم ملک میں کسی خلیفہ پر صحیح بیعت ہو جائے اور خلافت قائم ہو جائے، تو باقی دنیا کے مسلمانوں پر یہ حرام ہو جاتا ہے کہ وہ کہیں اور دوسری خلافت قائم کر لیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إذا بويع لخليفتين فاقتلوا الآخر منهما))

''جب بیعت دو خلفاء پر ہو جائے تو دوسرے کو قتل کر دو''

خلافت کا مقصد اسلامی شریعت کو، یعنی اُن افکار کو جو اسلام لایا اور اُن احکام کو جو اسلام نے طے کیے ہیں، قائم و نافذ کرنا ہے، نیز اسلام کی دعوت کو سارے عالم تک پہنچانا یعنی اُن کے سامنے اسلام کو واضح طور پر بیان کرنا اور اُس کی طرف دعوت دینا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے۔ اس خلافت کو امارت یا امارت المسلمین بھی کہا جاتا ہے اور یہ ایک دنیاوی منصب ہے اور یہ اخروی منصب نہیں ہے۔ پس خلافت کو وجود میں لایا جاتا ہے تاکہ انسان پر اسلام کو نافذ کیا جائے اور اسلام کو انسانوں کے درمیان پھیلایا جائے۔ اور یہ نبوت سے مطلقاً مختلف امر ہے۔

کیونکہ نبوت ایک منصبِ الٰہیہ ہے جو اللہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے، جس میں نبی یا رسول کو اللہ تعالیٰ سے وحی کے ذریعہ شریعت ملتی ہے؛ اس کے برعکس خلافت ایک بشری منصب ہوتا ہے جس میں مسلمان اپنی پسند سے جسے چاہتے ہیں بیعت کرتے ہیں اور مسلمانوں میں سے جسے پسند کرتے ہیں اپنا خلیفہ بنا لیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ بذاتِ خود حاکم تھے اور جو شریعت آپ لیکر آئے تھے، اسے نافذ کرتے تھے۔ آپ ﷺ بیک وقت نبوت و رسالت پر بھی فائز تھے اور دوسری طرف اسلامی احکام نافذ کرنے میں مسلمانوں کے امیر بھی تھے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رسالت کی تبلیغ کا حکم دیا تھا، اسی طرح آپ ﷺ کو حکومت کرنے کا بھی حکم دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا آپ ﷺ سے خطاب تھا:

﴿وَاَنِ احۡکُمۡ بَیۡنَھُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰہُ﴾

''اور یہ کہ تم اُن کے درمیان وہی فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے'' (المائدہ: 49)

﴿اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَیۡكَ الۡكِتَابَ بِالۡحَقِّ لِتَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰئكَ اللّٰہُ ؕ﴾

''یقیناً ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ تم لوگوں میں اس چیز کے مطابق فیصلہ کرو جس سے اللہ نے تمہیں شناسا کیا'' (النساء:105)

﴿وَ أُوحِیَ إِلَیَّ هٰذا القُرآنُ لأُنۡذِرَکُمۡ بِهِ وَ مَنۡ بَلَغَ﴾

''اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے تمہیں خبردار کردوں اور جس کسی کو یہ پہنچے وہ بھی یہ کام انجام دے'' (الانعام: 19)

﴿یَآأَیُّهَا الۡمُدَّثِّرُ ۝ قُمۡ فَاَنۡذِرۡ﴾

''اے لحاف میں لپٹنے والے، اٹھو اور خبردار کرنے میں مصروف ہوجاؤ'' (المدثر: 2-1)

چنانچہ آپ ﷺ ایک طرف منصبِ رسالت ونبوت پر اور دوسری جانب اللہ تعالیٰ کی وحی کردہ شریعت کو قائم ونافذ کرنے کیلئے تمام دنیا کے مسلمانوں کی امارت پر فائز تھے۔

البتہ آپ ﷺ کے بعد خلافت کے منصب پر بشر فائز ہوئے جو بہرحال نبی نہیں تھے اور اُن سے اُن غلطیوں، بھول چوک اور گناہ وغیرہ کا امکان تھا جو ایک انسان سے سرزد ہوسکتی ہیں کیونکہ وہ بہرحال بشر تھے۔ نیز یہ کہ چونکہ وہ نبی یا رسول نہیں تھے لہٰذا معصوم بھی نہیں تھے۔ پھر خود آپ ﷺ یہ بیان کرچکے تھے کہ امام یا خلیفہ سے غلطی کا امکان ہے، اسی طرح آپ ﷺ نے اس امکان سے بھی خبردار کیا تھا کہ خلیفہ کے ظلم یا گناہ سے عوام ناراض ہوسکتے ہیں، بلکہ یہاں تک خبردار کردیا تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ خلیفہ سے کفر بواح سرزد ہو اور ایسی حالت میں اُس کی اطاعت نہ کی جائے بلکہ اُس سے لڑا جائے۔ چنانچہ مسلم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((إنما الإمام جُنَّة، یُقاتَلُ مِن ورائهِ و یتقی بهِ،فإن أمر بتقوی اللّٰهِ عز وجلّ وعدل کان له بذلك أجر،وإن یأمر بغیرهِ کان علیه منه))

''بے شک امام ڈھال ہے جس کے پیچھے رہ کر مسلمان کفار سے لڑتے ہیں اور اپنا دفاع کرتے ہیں، پھر اگر وہ اللہ کے تقویٰ کا حکم کرے اور انصاف کرے تو اسے ثواب ہوگا اور اگر وہ اس کے برخلاف کرے تو اس پر وبال ہوگا''

یعنی یہ کہ امام معصوم نہیں ہوتے اور دوسرے یہ کہ اُن سے امکان ہے کہ وہ تقوی کے خلاف حکم کریں۔ مسلم نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((انها ستكون بعدي أثرة و أمور تنكرونها قالوا : يا رسول اللّٰه كيف تامر من ادرك منا ذلك؟ قال: تؤدون الحق الذي عليكم،و تسألون اللّٰه الذي لكم))

''میرے بعد خودغرضی کے معاملات ہوں گے اور ایسے امور ہوں گے جن سے تم نفرت کرو گے، صحابہؓ نے پوچھا کہ ہم میں سے جو اس کو پہنچے تو اس کیلئے کیا حکم ہے؟ فرمایا: جو تم پر حق ہے وہ دیتے رہو اور جو تمہارا حق ہے، اللہ سے مانگو''

بخاری میں جنادۃ ابن ابی امیہ سے روایت نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیمار تھے، ہم اُن کے پاس پہنچے اور اُن سے کہا کہ اللہ آپ رضی اللہ عنہ کو شفاء دے، آپ ہمیں کوئی ایسی حدیث سنایئے جو آپ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے سنی ہو، اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا، تو اُنہوں نے فرمایا:

دعانا النبي فبايعناه،فقال:فيما أخذ علينا أن بايعنا على السمع و الطاعة في منشطنا ومكرهنا،و عسرنا و يسرنا،و أثرة علينا، و أن لا ننازع الأمر أهله،قال:إلا أن تروا كفراً بواحاً عندكم من اللّٰه فيه برهان.))

ہمیں نبی ﷺ نے بلایا تو ہم نے آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ نے ہم سے ان شرائط پر بیعت لی کہ ہم پسندیدہ اور ناپسندیدہ کاموں میں، مشکل اور آسانی (کی حالت) میں اور اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دینے کی صورت میں بھی اطاعت کریں گے۔ اور ہم کسی اہلِ امر (حاکم) کے ساتھ اس کے منصب میں تنازع نہ کریں گے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''جب تک کہ تم کوئی واضح کفر نہ دیکھ لو جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے قطعی دلیل ہو''

ترمذی میں عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((ادرأوا الحدود عن المسلمين ما استطعتم،فإن كان له مخرج فخلوا سبيله. فإن الإمام أن يخطئ في العفو خير من أن يخطئ في العقوبة))

''مسلمانوں کو جہاں تک تم سے ممکن ہو سزاؤں سے بچاؤ، اگر اُس کیلئے کوئی راہ ہو تو اُس راہ کو اُس کیلئے کھول دو؛ امام کیلئے یہ بہتر ہے کہ اُس سے درگزر میں غلطی ہو جائے، بہ نسبت اس کے کہ سزا دینے میں غلطی ہو''

یہ تمام احادیث صریح ہیں کہ امام یا خلیفہ سے خطاء، بھول چوک اور معصیت کا امکان ہے، اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم دیا کہ جب تک خلیفہ اسلام کے احکامات کے ذریعے حکمرانی کرتا رہے اور اُس سے کفر بواح سرزد نہ ہو اور وہ معصیت کا حکم نہ دے، اُس کی اطاعت کرتے رہو۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفاء آئے جو معصوم نہیں تھے اور اُن سے خطا اور چوک سرزد ہوئی کیونکہ وہ نبی نہیں تھے، پس یہ کہنا درست نہیں کہ خلافت ریاستِ الٰہیہ ہوتی ہے، بلکہ یہ ایک بشری ریاست ہوتی ہے جس میں مسلمان خلیفہ کو بیعت دیتے ہیں تاکہ وہ اسلامی شریعت کے احکامات کو نافذ کرے۔

خلیفہ کی امارت کی میعاد:

خلیفہ کی امارت کسی معین مدت کے لیے نہیں ہوتی، بلکہ جب تک وہ شریعت کی حفاظت کرے، اس کے احکامات کو نافذ کرے، ریاست کے امور کی نگہداشت اور خلافت کی ذمہ داریوں پر قادر ہو، وہ خلیفہ ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بیعت کے متعلق جو احادیث وارد ہوئی ہیں وہ مطلق ہیں اور اُن میں وقتِ معین کی کوئی قید نہیں ہے، جیسا کہ بخاری نے انس ابن مالک ؓ سے رسول اللہ ﷺ کا قول نقل کیا ہے:

((اسمعوا و أطيعوا، و إن استُعمِل عليكم عبدٌ حَبَشِيٌّ، كان رأسهُ زبيبة.))

''سنواور اطاعت کرو، خواہ تمہارے اوپر ایک کالا حبشی ہی کیوں نہ مقرر کر دیا جائے جس کا سر کشمش کی طرح کا ہو''

ایک اور حدیث مسلم نے ام حصین سے نقل کی ہے جس کے یہ الفاظ ہیں:

((یقود کم بکتاب اللّٰہ.))

''وہ تم پر اللہ کی کتاب سے حکومت کرے''

اس کے علاوہ تمام خلفائے راشدین کو جو بیعت دی گئی وہ مطلق انداز میں تھی اور یہ بیعت احادیث میں وارد ہوئی ہے۔ یہ تمام خلفاء غیر محدود مدّت کیلئے خلیفہ تھے۔ ان سب نے بیعت کے ہوتے ہی خلافت کا منصب سنبھالا اور اپنی وفات تک منصبِ خلافت پر فائز رہے۔ یہ صحابۂ کرام ﷺ کا اجماع ہوا کہ خلافت کیلئے کوئی متعین مدّت نہیں ہوتی بلکہ یہ مطلق ہے، پس جب خلیفہ کو بیعت دے دی جائے تو وہ اپنی وفات تک خلیفہ ہوتا ہے۔

البتہ اگر خلیفہ کے ساتھ ایسی صورت ہو کہ جو اسے معزول کر دے یا اُس کا معزول کیا جانا واجب ہو جائے، تو اُس کی خلافت کی مدّت ختم ہو جاتی ہے اور وہ برطرف کر دیا جاتا ہے۔ لیکن بہر حال ایسی صورت خلافت کی مدّت کو اصلاً محدود نہیں کرتی بلکہ یہ تو خلافت کی شرائط میں خلل کا واقع ہونا ہے۔ لہٰذا نصوصِ شرع اور اجماع صحابہ سے بیعت کا جو صیغہ ثابت ہے، وہ خلافت کی مدت کو غیر محدود بناتا ہے؛ لیکن یہ خلافت اُس امر میں محدود ہے جس امر پر یہ بیعت دی گئی ہے، یعنی کتاب اللہ اور سنتِ رسول پر عمل پیرا ہونا اور اُس کے احکام کو نافذ کرنا؛ پس اگر خلیفہ شریعت کی حفاظت نہیں کرتا اور اُسے نافذ نہیں کرتا تو یہ واجب ہو جاتا ہے کہ اسے معزول کر دیا جائے۔

خلیفہ کی معزولی:

خلیفہ میں انعقادِ خلافت کی سات شرائط میں سے کسی ایک بھی شرط کے فقدان واقع

ہوجانے کی صورت میں اُس کیلئے شرعاً جائز نہیں رہتا کہ وہ خلافت پر برقرار رہے اور وہ برطرف کیے جانے کا مستحق ہوجاتا ہے۔

خلیفہ کی معزولی کا فیصلہ کرنے کا اختیار صرف محکمۂ مظالم ہی کو ہوتا ہے۔ محکمۂ مظالم سب سے پہلے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کیا خلیفہ میں انعقادی شرائط میں سے کسی شرط کا فقدان واقع تو نہیں ہوگیا، اس لئے کہ کسی ایسے امر کا واقع ہونا جس سے خلیفہ معزول ہوجاتا ہے یا وہ معزول کیے جانے کا مستحق ہوجاتا ہے، فی الحقیقت مظالم میں سے ایک مظلمہ ہوتا ہے جس کا ازالہ کیا جانا ضروری ہوجاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو ثبوت کا محتاج ہوتا ہے، اور ضروری ہے کہ یہ قاضی کے روبرو ثابت ہو۔ اور چونکہ محکمۂ مظالم ہی وہ ادارہ ہوتا ہے جو مظالم کے ازالہ کے فیصلے کرتا ہے، نیز قاضیٔ مظالم ہی کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ مظالم کے ہونے کو طے کرکے اُس پر حکم جاری کرے۔ چنانچہ محکمۂ مظالم ہی خلیفہ میں شرائطِ انعقاد کے نقص واقع ہوجانے کا فیصلہ کرتا ہے اور پھر خلیفہ کو معزول کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ البتہ اگر کسی انعقادی شرط میں نقص ہوجانے پر خلیفہ ازخود ہی علیحدہ ہوجائے تو یہ معاملہ وہیں ختم ہوجاتا ہے۔ لیکن اگر مسلمان یہ جان لیں کہ خلیفہ میں کوئی انعقادی شرط مفقود ہوگئی ہے اور پھر خلیفہ اس بات کو تسلیم نہ کرے تو یہ معاملہ فیصلہ کیلئے قاضی کے پاس جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾

پھر اگر کسی چیز میں تم اختلاف کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو'' (النساء:59)

یہاں تنازعہ سے مراد اولی الامر اور امت کے درمیان تنازعہ ہے اور اللہ اور اُس کے رسول کی طرف لوٹا دینے سے مراد عدالت کی طرف لوٹا دینا یعنی محکمۂ مظالم سے رجوع کرنا ہے۔

خلیفہ کے تقرر کیلئے مسلمانوں کو دی گئی مدّت:

خلیفہ کو مقرر کرنے کیلئے جو مدّت مسلمانوں کو دی ہے وہ تین دن بشمول ان کی راتیں ہیں۔ ایک مسلمان کیلئے جائز نہیں ہے کہ اُس پر تین دن اس طرح گزر جائیں کہ اُس پر بیعت کا

طوق نہ ہو۔ جہاں تک اِس مدّت کو تین دن بشمول تین راتوں تک محدود کرنے کا معاملہ ہے، تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ سابق خلیفہ کی وفات یا معزول کئے جانے کے لمحہ سے خلیفہ کا تقرر کرنا فرض ہو جاتا ہے، لیکن اگر مسلمان اس مدّت کے دوران خلیفہ کو نصب کرنے کے کام میں مشغول ہوں تو اس میں تین دن اور تین راتوں کی تاخیر جائز ہے؛ اور اگر اس مدّت کے گزر جانے کے باوجود خلیفہ کی تنصیب نہیں ہو پاتی تو پھر قابلِ غور یہ ہوگا کہ آیا مسلمان اس کام میں مصروف تھے لیکن بعض ایسے حالات کی وجہ سے کام کو تکمیل نہ پہنچا سکے جو اِن کی دسترس سے باہر تھے، ایسی صورت میں کام کو انجام نہ دے پانے کا گناہ اُن پر نہ ہوگا کیونکہ وہ فرض میں بہرحال لگے رہے اور اس میں ہونے والی تاخیر اُن کی پسند سے نہ تھی۔ ابنِ حبان اور ابنِ ماجہ میں ابنِ عباس ﷺ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إنَّ اللهَ وَضَعَ عَن أمتي الخطأ و النسيان و ما أستكرِهوا عليه.))

''اللہ تعالیٰ نے میری امت سے غلطی، بھول چوک اور جس پر وہ مجبور ہو، کو معاف کر دیا ہے''

اس کے برعکس اگر مسلمان خلیفہ کے نصب کئے جانے کے کام میں مشغول نہ ہوں تو سب کے سب گنہگار ہوں گے جب تک کہ یہ کام انجام نہ پا جائے اور یہ فرض اُن سے ساقط نہ ہو جائے۔ اس فرض سے غافل پڑے رہنے کا گناہ البتہ اُن پر باقی رہے گا جس کا محاسبہ اللہ تعالیٰ اُن سے کرے گا جیسا کہ وہ مسلمانوں سے دیگر فرائض میں کوتاہیوں کا محاسبہ کرے گا۔

خلافت کے منصب کے خالی ہوتے ہی فوراً اس عمل میں مشغول ہو جانے کی دلیل صحابۂ کرام کا عمل ہے جو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے فوراً بعد اُسی دن سقیفۂ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور آپ ﷺ کی تدفین سے پہلے اُسی دن ابوبکر صدیق ﷺ کی بیعتِ انعقاد مکمل کر لی اور دوسرے دن مسلمان مسجدِ نبوی میں جمع ہوئے اور پھر بیعتِ اطاعت ہوئی۔

جہاں تک خلیفہ کو نصب کئے جانے کیلئے معینہ مدّت کے تین دن بشمول ان کی تین راتوں کے ہونے کا تعلق ہے، تو یہ اس بنا پر ہے کہ عمر ﷺ کو جب زخموں کے باعث اپنی موت کا یقین ہو گیا، تو آپؓ نے اہلِ شوریٰ کے لیے تین دن کی مدّت کی حد لگائی۔ پھر آپ ﷺ نے یہ

ہدایت کی کہ اگر اس مدّت میں یہ کام انجام نہیں پاتا تو جو شخص مخالفت کرے اُس کو اس مدّت کے بعد قتل کر دیا جائے، نہ صرف یہ بلکہ آپؓ نے مسلمانوں کے پچاس آدمیوں کو یہ کام سونپا یعنی وہ مخالف کو قتل کر دیں، جبکہ وہ ممکنہ مخالف اہلِ شوریٰ اور جلیل القدر صحابہ میں سے تھا۔ یہ سب تمام صحابۂ کرام کے عین سامنے پیش آیا اور اس کا انکار یا کراہت کسی بھی صحابی سے منقول نہیں ہے! لہٰذا یہ صحابۂ کرام کا اس بات پر اجماع تھا کہ یہ جائز نہیں کہ مسلمان تین دن اور تین راتوں سے زیادہ خلیفہ کے بغیر رہیں۔ اور صحابۂ کرام کا اجماع، قرآن اور سنت کی مانند شرعی دلیل ہے۔

بخاری نے مِسور بن مخرمہ ﷺ سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں: عبدالرحمٰن بن عوف ﷺ نے میرے دروازے پر رات کو دستک دی یہاں تک کہ میں اُٹھ گیا جبکہ میں آرام سے سو رہا تھا اور کہا ''تم سو رہے ہو؟ میں تو اِن تین راتوں میں بمشکل ہی سو پایا ہوں''۔ پھر جب لوگوں نے فجر کی نماز پڑھی تو عثمان ﷺ کی بیعت ہوئی۔

چنانچہ مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ خلافت کے خالی ہوتے ہی وہ آئندہ خلیفہ کی بیعت کے کام میں مشغول ہو جائیں اور تین دنوں کے اندر اس کام کو مکمل کر لیں۔ اس کے برعکس مسلمان خلیفہ کی بیعت کے کام سے غافل رہے، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خلافت کا ہی خاتمہ ہو گیا اور وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے، تو وہ اس غفلت کی بنا پر اس وقت سے گنہگار رہوں گے جب خلیفہ کو ہٹایا گیا۔ جیسا کہ آج امت کی صورتِ حال ہے کہ مسلمان 28 رجب 1342 ہجری سے، جب خلافت کا خاتمہ ہوا تھا، اب تک اس کام سے غفلت برتنے پر گنہگار ہیں۔ اس گناہ سے صرف وہی بَری رہا جو کسی مخلص اور سچی جماعت کے ساتھ پورے انہماک سے شامل ہو کر اس کام میں جُت گیا، اسی طرح کوئی اس گناہ سے نجات پا سکتا ہے، اور یہ گناہ ایک گناہِ عظیم ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((ومن مات وليس في عنقه بيعة مات ميتة جاهلية))(مسلم)

''اور جو کوئی بھی اس حال میں مر گیا کہ اُس کی گردن پر خلیفہ کی بیعت کا طوق نہ ہو، تو وہ جاہلیت کی موت مرا''

دوسرا:

معاونین (وزرائے تفویض)

معاونین وہ وزراء ہیں جنہیں خلیفہ اپنے لیے مقرر کرتا ہے تاکہ وہ خلافت کی ذمہ داریوں میں خلیفہ کی معاونت کریں۔ خلافت کی ذمہ داریاں کثیر ہوتی ہیں خاص طور پر جب ریاستِ خلافت بڑھ رہی ہو اور اُس میں توسیع ہو رہی ہو تو خلیفہ کیلئے اکیلا ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآء ہونا مشکل ہوتا ہے اور ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی اس کام میں اُس کی معاونت کرے۔

معاونین کو کسی قید کے بغیر وزراء کا نام دینا درست نہیں ہے تاکہ وزراء کی اصطلاح کا وہ مفہوم جو موجودہ دور کے سیکولر جمہوری سرمایہ دارانہ نظام یا کسی اور موجودہ نظام میں پایا جاتا ہے اس مفہوم سے گڈمڈ نہ ہو جو اسلامی نظام میں پایا جاتا ہے۔

وزیرِ تفویض یا معاونِ تفویض وہ ہوتا ہے جسے خلیفہ مقرر کرتا ہے تاکہ وہ اس کے ساتھ مل کر حکومت اور اقتدار کی ذمہ داری کو سنبھالے۔ پس خلیفہ اسے اپنی رائے اور اجتہاد کے مطابق اور احکاماتِ شریعت کے موافق امور کو سرانجام دینے کی ذمہ داری سونپتا ہے۔ اور خلیفہ معاون کو عمومی نیابت اور معاملات کی عمومی دیکھ بھال (General Supervision) کا اختیار سونپتا ہے۔

حاکم اور ترمذی نے ابوسعید خذری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَزِيراي مِن السَماء جبريل و ميكائيل، ومن الأرض أبو بكر و عمر))

''آسمان پر میرے دو وزیر جبریل اور میکائیل ہیں اور زمین میں ابوبکر اور عمر''

اس حدیث میں لفظِ وزیر کے معنی مدد و معاونت کرنے والے کے ہیں اور یہی اس کے لغوی معنی بھی ہوتے ہیں؛ قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَاجْعَلْ لِّي وَزِيرًا مِّنْ أَهْلِي﴾

''اور میرے لئے میرے اپنے گھر والوں میں سے ایک ہاتھ بٹانے والا مقرر کر دے'' (طٰہٰ:29)

حدیث میں یہ لفظ اپنے مطلق معنوں میں آیا ہے، یعنی ہر قسم کی مدد اور معاونت کے معنوں میں، خواہ وہ کسی بھی معاملہ میں ہو اور خلافت اور اُس سے متعلق ذمہ داریاں بھی اس کے ضمن میں ہیں۔ اس روایت میں معاونت سے مراد صرف حکومتی معاونت ہی نہیں ہے، کیونکہ اس میں جبرئیل اور میکائیل کو آسمان میں آپ ﷺ کا وزیر بتایا ہے اور اُن کا حکومت کے کاموں اور ذمہ داریوں میں کوئی دخل نہیں تھا۔ لہٰذا اس حدیث میں لفظ وزیر صرف اپنے لغوی معنوں میں آیا ہے اور اس سے مراد مدد و معاونت ہے، نیز اس حدیث سے وزیروں کی تعداد ایک سے زیادہ ہونے کا جواز بھی ملتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کا وزیر ہونے کے باوجود حکومت کی ذمہ داریوں میں شریک ہونا نظر نہیں آتا؛ اگرچہ وہ وزیر بنائے گئے تھے اور انھیں حکومتی اعمال میں بغیر کسی تخصیص کے تمام معاملات میں معاونت کے اختیار دئے گئے تھے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالنے کے بعد عمر رضی اللہ عنہ کو اپنا وزیر مقرر کیا اور یہ معاونت بہت واضح تھی۔

عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالنے کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ کو اپنا معاون مقرر کیا۔ تاہم اِن دونوں صحابہ کا حکومتی اعمال کو انجام دینا واضح طور پر نظر نہیں آتا، ان کی صورت حال ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی معاونت کے مشابہ تھی۔ عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اُن کے وزراء علی رضی اللہ عنہ اور مروان بن الحکم رہے، البتہ علی رضی اللہ عنہ کو چونکہ بعض معاملات پسند نہیں تھے لہٰذا انہوں نے اپنے آپ کو پیچھے رکھا لیکن مروان بن حکم کا حکومتی کاموں میں عثمان رضی اللہ عنہ کا معاون ہونا عیاں تھا۔

معاون تفویض اگر ایک صادق شخص ہو تو یہ خلیفہ کیلئے نہایت نفع بخش ہوگا کیونکہ وہ خیر کی نشاندہی کرے گا اور اس میں خلیفہ کی معاونت کرے گا۔ مسند احمد میں عائشہؓ سے روایت ہے، جس کے بارے میں امام نووی کہتے ہیں کہ اس کے رجال ثقہ ہیں، نیز بزّار نے بھی اسے روایت کیا ہے اور علامہ ہیثمی کہتے ہیں کہ اس کے رجال، رجال صحیح ہیں، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إذا أراد اللّٰه بالأمير خيراً جعل له وزير صدق،إن نسي ذكَّره،وإن ذكر أعانه؛وإذا أراد الله به غير ذلك،جعل له وزير سوء إن نسي لم يذكِّره وإن ذكر لم يعينه))

''جب اللہ تعالیٰ کسی امیر کیلئے خیر چاہتا ہے تو اسے بہتر وزیر دے دیتا ہے جو اسے بھول جانے پر یاد دلاتا ہے اور جب امیر کہے تو وہ اس کی مدد کرتا ہے؛ اور جب اللہ تعالیٰ اس کے علاوہ چاہتا ہے تو امیر کو برا وزیر دے دیتا ہے، جو اسے بھولنے پر یاد نہیں دلاتا اور کہنے پر اُس کی مدد نہیں کرتا''

رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین ؓ کے عہد میں معاونین کے عمل پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ معاون کو مخصوص معاملات سونپے جاسکتے ہیں جن کی وہ عمومی دیکھ بھال کریں یا پھر اسے تمام معاملات سونپے جاسکتے ہیں کہ جن کی وہ عمومی انداز میں دیکھ بھال کریں۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا کسی مخصوص مقام یا مقامات پر تعین کیا جائے جہاں کی وہ عمومی دیکھ بھال کرے۔ بخاری اور مسلم میں ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ:

(بعث رسول اللّٰه عمر على الصدقة)

''رسول اللہ ﷺ نے عمر ؓ کو صدقات (وصول کرنے) کیلئے بھیجا''

نیز ابنِ خزیمہ اور ابنِ حبان میں مروی ہے:

(أن رسول اللّٰه حين رجع من عمرة الجعرانة،بعث ابا بكر على الحج)

''کہ جب رسول اللہ ﷺ جعرانہ کے عمرہ سے لوٹے تو ابو بکر ؓ کو حج پر امیر بنا کر روانہ کیا''

یعنی ابو بکر ؓ اور عمر ؓ جو باوجود اس کے کہ رسول اللہ ﷺ کے وزیر تھے، انھیں بعض مخصوص کاموں پر عمومی نگرانی سونپی گئی، نہ کہ تمام افعال پر؛ جبکہ اُن کے وزیر ہونے کے باعث

اُنھیں سونپی گئی وزارتِ تفویض کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں تمام افعال وامور پر عام نگرانی حاصل ہو۔ یہی صورتِ حال عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھی۔ جبکہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں عمر رضی اللہ عنہ کا معاون ہونا اس قدر عیاں تھا کہ بعض صحابہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے یہاں تک کہا کہ ہمیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمر رضی اللہ عنہ، البتہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ کو بعض دفعہ عدلیہ کی ذمہ داری بھی سونپی، جیسا کہ بیہقی نے روایت کیا ہے، جسے حافظ نے قوی قرار دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور بعد میں خلفائے راشدین کے عہد کو بغور دیکھیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ معاون خلیفہ کا نائب ہوتا تھا اور اسے عمومی دیکھ بھال کی ذمہ داری سونپی جاتی تھی، لیکن یہ ممکن ہے کہ معاون کیلئے کوئی مخصوص کام یا مخصوص مقام طے کردیا جائے؛ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا گیا، یا جس طرح ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا، لہٰذا ایک معاون یا وزیر کو مثلاً شمالی علاقوں کیلئے اور دوسرے کو جنوبی علاقوں کے مقرر کردیا جائے، یا پھر ایک کی جگہ پر دوسرے کو منتقل کردیا جائے، یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ خلیفہ کی معاونت کے تقاضے کے لحاظ سے، ایک معاون کو کسی مخصوص عمل کیلئے متعین کیا جائے اور دوسرے افعال کیلئے دیگر معاون مقرر کیا جائے۔ ایسی منتقلی کیلئے ازسرِنو تقرری کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ یہ کافی ہے کہ اسے محض ایک معاملے سے دوسرے معاملے پر منتقل کردیا جائے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ معاون کی تقرری میں عمومی دیکھ بھال اور نیابت شامل ہوتی ہے، لہٰذا یہ تمام افعال اصلاً اُس کے دائرۂ کار میں شامل ہیں۔ اس حیثیت سے معاون اور والیوں میں فرق ہوتا ہے؛ والی کی تقرری ایک مخصوص مقام کیلئے ہوتی ہے جو اُس کا دائرۂ کار ہوتا ہے، والی کو دوسرے مقام یا ولایت پر منتقل نہیں کیا جاسکتا بلکہ کسی اور مقام پر اُس کی منتقلی کے لیے نئی تقرری کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ یہ نیا مقام یا ولایت اُس کی پہلی تقرری میں شامل نہیں تھا۔ اس کے برعکس ایک معاون کی تقرری میں کیونکہ عمومی دیکھ بھال اور نیابت شامل ہوتی ہے لہٰذا معاون کو بغیر دوبارہ مقرر کئے ایک مقام سے دوسرے مقام منتقل کیا جاسکتا ہے۔

پچھلی سطور سے یہ واضح ہوا کہ خلیفہ اپنے معاون کو نیابت کا جو اختیار دیتا ہے وہ تمام

ریاست پر اور ہر قسم کے امور پر محیط ہوتا ہے۔ البتہ خلیفہ کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ معاون کو کوئی مخصوص کام سونپے یعنی مثلاً معاون کو مشرقی صوبوں یا پھر مغربی صوبوں پر تعینات کرے، وغیرہ۔ یہ اُس وقت خاص طور پر ضروری ہو جاتا ہے جب وزراء کی تعداد ایک سے زیادہ ہو، تا کہ ایک وزیر کی ذمہ داری دوسرے کی ذمہ داری سے نہ ٹکرائے۔

کیونکہ خاص طور پر ریاست کی توسیع کے دوران خلیفہ کو ایک سے زیادہ معاون کی ضرورت ہوتی ہے، اور ایسے میں ہر ایک معاون کا دائرۂ کار تمام ریاست پر محیط ہونا مشکلات کا سبب بن سکتا ہے، اور ہر ایک معاون کو نیابت اور عمومی دیکھ بھال کا اختیار حاصل ہونے سے ایک دوسرے کے دائرۂ کار میں مداخلت کا امکان بڑھ جاتا ہے؛ چنانچہ ہم یہ تبنی کرتے ہیں:

جہاں تک معاون کی تقرری کا سوال ہے، تو معاون کو تمام ریاست پر عمومی دیکھ بھال اور نیابت کے ساتھ مقرر کیا جائے گا۔

جہاں تک معاونین کے دائرۂ کار کا تعلق ہے تو اُنھیں ریاست کے ایک مخصوص حصہ پر متعین کیا جائے گا؛ یعنی ایک معاون ریاست کے مثلاً مشرقی حصہ پر ہو اور دوسرا مغربی پر، تیسرا شمالی حصہ پر وغیرہ۔

جہاں تک معاونین کے تبادلے یا اُنہیں منتقل کرنے کا سوال ہے، تو اُنھیں ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک معاملے سے دوسرے معاملے پر نئے سرے سے مقرر کئے بغیر تقرری کے سابقہ عقد (contract) کی بنیاد پر ہی منتقل کیا جائے گا، کیونکہ اُن کی اصل تقرری میں تمام افعال بہر حال شامل تھے۔

معاون تفویض کیلئے شرائط:

معاون تفویض کیلئے وہی شرائط ہوں گی جو خلیفہ کیلئے ہوتی ہیں، یعنی معاون مَرد، مسلمان، آزاد، بالغ اور عاقل و عادل ہو اور جو ذمہ داری اسے سونپی جا رہی ہے اُس کا اہل ہو۔

اِن شرائط کیلئے جو دلائل ہیں وہ وہی دلائل ہیں جو خلیفہ کی شرائط کے ضمن میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ چونکہ معاون کا کام حکومت کرنا ہے لہٰذا اُس کا مرد ہونا لازمی ہے، جیسا کہ بخاری میں ابی بکرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لن يفلح قوم ولّوا أمرهم امرأة))

''وہ قوم جو اپنے امور پر عورت کو والی بنالے، ہرگز کامیاب نہیں ہوگی''

دوسری شرط یہ کہ وہ آزاد ہو کیونکہ ایک غلام اپنے ہی اوپر تصرف نہیں رکھتا چنانچہ وہ دوسروں کے امور پر بھی ذمہ دار نہیں ہوسکتا۔ تیسری شرط یہ کہ وہ بالغ ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((رُفع القلم عن ثلاثة: عن الصبي حتى يبلغ؛ وعن النائم حتى يستيقظ؛ و عن المعتوه حتى يبرأ))

''تین قسم کے لوگوں کا محاسبہ نہیں ہوگا: کم سن، جب تک کہ وہ بلوغت کو نہ پہنچ جائے؛ سویا ہوا شخص، جب تک کہ وہ نیند سے نہ جاگ جائے؛ اور مجنون (دیوانہ) جب تک کہ وہ صحت یاب نہ ہو جائے''

چوتھی شرط کہ وہ عاقل ہو، کیونکہ اسی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((و عن المعتوه حتى يبرأ)) ''اور مجنون (دیوانہ) جب تک کہ وہ صحت یاب نہ ہو جائے'' یا جیسا کہ ایک اور روایت میں آیا ہے ((المجنون المغلوب على عقله حتى يفيق)) ''مجنون جسکی عقل درست نہیں، جب تک کہ وہ شفایاب نہ ہو جائے''۔ اسی طرح معاون کیلئے عادل ہونا بھی شرط ہے؛ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ شرط ایک گواہ کیلئے لازم فرمائی ہے:

﴿وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾

اور اپنے میں سے دو صاحبِ عدل آدمیوں کو گواہ بنالو'' (الطلاق:2)

لہٰذا اس شرط کا ایک معاون کیلئے ہونا بدرجہ اولیٰ ہے۔ نیز معاون کیلئے حکومتی کام کاج کا اہل ہونا بھی ضروری ہے تاکہ وہ خلافت کی ذمہ داریوں اور حکومت و اقتدار میں خلیفہ کی مدد و

معاونت کر پائے۔

معاون تفویض کی ذمہ داریاں:

معاونِ تفویض کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ جس معاملے کے لیے کوئی تدبیر تیار کرے تو خلیفہ کو اُس سے باخبر کرے اور پھر اُس کام کے انجام پا جانے کے بعد خلیفہ کو اس کی انجام دہی سے سے مطلع کرے کہ اُس نے اپنی ذمہ داریوں اور اتھارٹی میں سے کیا کچھ انجام دیا ہے، تا کہ وہ اپنے اختیارات میں خلیفہ کی مانند نہ ہو جائے۔ چنانچہ معاون کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ خلیفہ کے سامنے اپنے جائزے کو پیش کرے اور اس کو نافذ کرے، جب تک کہ خلیفہ اُسے اُس کام سے روک نہ دے۔

اس کی دلیل خود معاونت کی حقیقت ہے کہ معاون خلیفہ کا اُن امور میں جو اُسے سونپے جائیں، نائب ہوتا ہے۔ ایک نائب کسی کام کو اُس شخص کی طرف سے انجام دیتا ہے جس کا وہ نائب ہوتا ہے، لہٰذا ایک معاون بذاتِ خود خلیفہ سے آزاد و خود مختار نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ خلیفہ کو ہر کام سے مطلع رکھتا ہے جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہ جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کے معاون تھے، تو وہ کیا کرتے تھے۔ وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنی رائے سے مطلع رکھتے اور اسی کے مطابق عمل کو انجام دیا کرتے تھے۔ یہاں خلیفہ کو ہر بات سے آگاہ رکھنے سے مراد کسی عمل کی جزئیات میں خلیفہ کی اجازت سے نہیں ہے؛ یہ تو معاون کی ذمہ داریوں اور اُس کے کام کی حقیقت کے خلاف ہوگا، بلکہ خلیفہ کو باخبر رکھنے سے مراد ہے کہ اس معاملے کو خلیفہ سے ڈسکس کرنا جیسے کسی ولایہ میں ایک قوی شخص کو والی مقرر کرنے کی ضرورت یا وہاں کے لوگوں کی غذاء کی قلت کی شکایت کا ازالہ یا کوئی بھی ریاستی معاملہ۔ یا پھر معاون خلیفہ کے سامنے کسی معاملے کو تجویز کی شکل میں پیش کرے، جو کہ اس بات کے لیے کافی ہوگا کہ وہ اس میں بیان کردہ تمام اعمال کو اپنی تمام تر جزئیات سمیت سرانجام دے اور اسے اس معاملے میں مزید اجازت کی ضرورت نہ ہو۔ البتہ اگر خلیفہ ایسا کوئی حکم صادر کردے جن کی رُو سے وہ معاون کو اِن افعال پر کارروائی سے روک دے تو پھر معاون کیلئے اُن افعال کی انجام دہی درست نہیں۔ لہٰذا

پری زنٹیشن سے مراد تجویز کو خلیفہ کے سامنے پیش کرنا اور اس کے متعلق خلیفہ سے تبادلۂ خیال کرنا ہے نہ کہ اس کی انجام دہی کیلئے خلیفہ کی اجازت طلب کرنا۔ چنانچہ معاون اس تجویز کو نافذ کرتا ہے تاوقت یہ کہ خلیفہ معاون کو اس کے نفاذ سے روک دے۔

خلیفہ پر یہ لازم ہے کہ وہ معاون کے افعال اور امور کی تدبیر کی جانچ پڑتال کرے تاکہ جو افعال اس کے اجتہاد کے موافق انجام پائے ہیں اُنہیں برقرار رکھے اور وہ افعال جن میں غلطی ہوئی ہے ان کا تدارک کیا جا سکے، کیونکہ فی الحقیقت امور کی نگہداشت خلیفہ کی ذمہ داری ہے اور اُس ہی کے اجتہاد پر منحصر ہوتی ہے۔ اس ذمہ داری کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ سے حدیث منقول ہے:

((...الإمام راع وهو مسؤول عن رعيته))

''امام نگران ہے، اور اپنی رعایا کا ذمہ دار ہے'' (بخاری)

لہٰذا امور کی نگہداشت کا ذمہ دار خلیفہ ہی ہے اور وہی رعایا کا ذمہ دار ہے نہ کہ معاونِ تفویض، معاون تو صرف اُن افعال کا ذمہ دار ہوتا ہے جنھیں وہ انجام دے، رعایا کی ذمہ داری تو صرف خلیفہ ہی کی ہوتی ہے۔ چنانچہ خلیفہ کیلئے معاون کے کام کاج کی جانچ پڑتال کرنا ضروری ہے تاکہ رعیت کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ادا ہو۔ مزید یہ کہ معاونِ تفویض سے خطاء کا امکان ہے جس کا بہرحال تدارک کیا جانا ناگزیر ہے، لہٰذا خلیفہ کیلئے معاون کے تمام افعال کی جانچ پڑتال کرنا لازمی ہے۔ بالفاظِ دیگر، ایک تو اس زاویہ سے خلیفہ کو اپنی ذمہ داری ادا کرنا ہے اور دوسرے معاون سے ہوئی خطاؤں کے ازالہ کیلئے خلیفہ کیلئے ناگزیر ہے کہ وہ معاون کے تمام افعال کی جانچ کرے۔

جب معاون کسی معاملے میں کوئی پلان بنائے اور خلیفہ اُسے قبول کرلے، تو معاون اسے اُسی طرح بغیر کسی کمی بیشی کے نافذ کردے۔ لیکن اگر خلیفہ، معاون کے کسی کام کو جو انجام پا چکا ہو، مسترد کردے تو معاملہ کی حقیقت کو دیکھا جائیگا؛ اگر صورتِ حال یہ ہے کہ کسی فیصلہ کو بعینہٖ نافذ کیا گیا ہو، یا رقم کسی صحیح مصرف میں خرچ کی گئی ہو، تو معاون کی رائے ہی نافذ رہے گی، کیونکہ فی

الحقیقت وہ خلیفہ ہی کی رائے تھی، اور خلیفہ کو حق نہیں کہ وہ اپنے کسی فیصلے کو تبدیل کرے خواہ وہ رقوم سے متعلق ہو؛ لیکن اس کے برخلاف اگر معاملہ کی نوعیت مثلاً فوج کی تیاری یا والی کے تقرر کی ہو، تو خلیفہ کو حق ہے کہ وہ معاون کے فیصلہ کو مسترد کر کے اپنی رائے نافذ کرے۔ کیونکہ خلیفہ کو اپنے خود کیے ہوئے ایسے اقدامات کو تبدیل کرنے کا حق حاصل ہے، لہٰذا اُسے معاون کے اقدامات کو بدلنے کا حق بھی ہے۔

معاون کے کام اور اُس پر خلیفہ کی نگرانی یا نظر ثانی کی نوعیت یہ ہوگی: اس کی بنیاد یہ ہے کہ خلیفہ کن کاموں پر نظر ثانی کر کے انہیں تبدیل کر سکتا ہے اور کہاں ایسے کاموں کو تبدیل کرنے کا حق نہیں رکھتا، کیونکہ معاون تفویض کے ذریعہ انجام پائے گئے افعال خلیفہ ہی کے افعال تصور کئے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر معاون ٹھیک اُسی طرح خود حکم صادر کر سکتا ہے اور حکام کی تقرری کر سکتا ہے جیسے خلیفہ کرتا ہے، کیونکہ معاون کو یہ اختیارات دیے گئے ہیں؛ معاون مظالم کی شکایات پر بھی ایکشن لے سکتا ہے کیونکہ یہ اختیار بھی اُسے سونپا گیا ہے؛ وہ جہاد پر بھی تصرف رکھتا ہے یا کسی کو یہ تصرف دے سکتا ہے، کیونکہ جنگ کے اختیارات بھی اُسے حاصل ہیں؛ معاون کسی بھی امور جس پر اُس نے فیصلہ لیا ہو، عمل درآمد کر سکتا ہے یا کسی اور کو اُن امور پر عمل درآمد کیلئے مقرر کر سکتا ہے، کیونکہ اُسے اپنی رائے اور امور کے اہتمام کا اختیار سونپا گیا ہے۔ لیکن اس سب کا یہ قطعاً مطلب نہیں کہ معاون جو کچھ بھی انجام دیدے یا نافذ کر دے، خلیفہ اُسے اس بنیاد پر کہ اسے اطلاع دی جا چکی ہے، منسوخ نہیں کر سکتا، کیونکہ معاون کے اختیارات خلیفہ جیسے ہی ہوتے ہیں، لیکن اس کے یہ اختیارات خلیفہ کے نائب ہونے کی حیثیت سے ہوتے ہیں، نہ کہ اس کی خلیفہ سے جدا اور خود مختار اپنی کسی مستقل حیثیت کی بنا پر۔ خلیفہ کو بہرحال یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ معاون کے انجام دیے ہوئے کسی بھی کام سے اختلاف کرے اور اسے مسترد کر دے۔ البتہ جہاں تک ان کاموں کے مسترد کئے جانے کا سوال ہے جو سرانجام دیے جا چکے ہوں، تو یہ اُنہی حدود میں ممکن ہے، جن میں خلیفہ خود اپنے پایۂ تکمیل پہنچ جانے والے کاموں کو مسترد کرنے کا حق رکھتا ہے۔ پس اگر معاون نے کوئی حکم کما حقہ نافذ کیا، یا رقوم صحیح مصرف میں خرچ کیں اور خلیفہ اِن کاموں کے ہو چکنے

کے بعد ان پر اعتراض کرے تو یہ اعتراض قابلِ قبول نہ ہوگا، بلکہ معاون کا فیصلہ ہی نافذ ہوگا اور خلیفہ کی رائے اور اعتراض مسترد ہو جائے گی، کیونکہ جو انجام پا چکا، وہ تو فی الحقیقت خلیفہ ہی کی رائے تھی۔ اس صورتِ حال میں خلیفہ کیلئے یہ صحیح نہیں کہ وہ اپنی رائے سے ہٹ جائے یا جو انجام پا چکا ہو اُسے منسوخ کرے، اور اپنے معاون کے ذریعے انجام دیا گیا کام مسترد کر دے۔ لیکن اگر معاون نے مثلاً ایک والی یا کوئی ملازم مقرر کیا ہو، یا فوج کا سربراہ وغیرہ مقرر کیا ہو، یا مثلاً اقتصادی پالیسی وضع کی ہو، فوجی اسکیم تیار کی ہو یا صنعتی اسکیم تیار کی ہو وغیرہ، تو خلیفہ کیلئے انہیں منسوخ کرنا جائز ہوگا، کیونکہ اگرچہ یہ خلیفہ کی اپنی رائے تصور کئے جائیں گے مگر ان اعمال کا تعلق افعال کی اس قسم سے ہے کہ خلیفہ اگر خود بھی یہ افعال انجام دے، تو اس کیلئے یہ جائز ہے کہ وہ اِن سے پیچھے ہٹ جائے یا اِنہیں ترک کر دے۔ لہٰذا ایسی صورتِ حال میں خلیفہ اپنے معاون کے انجام دیے ہوئے افعال کو منسوخ کر سکتا ہے۔ ان دونوں حالتوں کی بنیاد یہ قاعدہ ہے کہ: خلیفہ کیلئے اپنے انجام دیے ہوئے جن افعال کو منسوخ یا ردّ کرنا جائز ہے، وہ اپنے معاون کے ایسے ہی افعال کو منسوخ یا ردّ کر سکتا ہے؛ اور ہر وہ امر جو اگر خود خلیفہ نے انجام دیا ہو اور اسے منسوخ کرنا خلیفہ کیلئے جائز نہ ہو، تو خلیفہ اپنے معاون کے ایسے افعال کو بھی منسوخ یا ردّ نہیں کر سکتا۔

رہی بات معاون کو انتظامی ڈھانچے کے کسی شعبے مثلاً شعبۂ تعلیم تک محدود کرنے کی، تو جو لوگ انتظامی امور سنبھالتے ہیں وہ ملازمین ہوتے ہیں نہ کہ حاکم؛ جبکہ معاون تفویض حاکم ہوتا ہے نہ کہ ملازم۔ معاون تفویض کا کام امور کا اہتمام کرنا ہے نہ کہ وہ کام کرنا جن کیلئے ملازمین کا تقرر کیا جاتا ہے۔

لہٰذا معاون تفویض محض انتظامی امور پر مامور نہیں ہو سکتا، گو کہ وہ انتظامی امور بھی انجام دے سکتا ہے کیونکہ اس کا اختیار عمومی نگرانی پر مشتمل ہوتا ہے۔

معاونین کا تقرر اور اُن کی برطرفی:

معاونین کا تقرر، نیز اُن کی معزولی خلیفہ کے حکم سے عمل میں آتی ہے اور خلیفہ کی وفات پر معاون کی نیابت ختم ہو جاتی ہے اور وہ اپنے عہدے پر برقرار نہیں رہتے، ماسوائے امیر مؤقت کی مدّت کے دوران۔ اس مدّت کے بعد اُنھیں اپنے سابقہ عہدوں پر باقی رہنے کیلئے نئے خلیفہ کی جانب سے دوبارہ مقرر کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ اُنھیں برطرف کرنے کیلئے کسی حکم کے جاری کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ اُن کی میعاد سابقہ خلیفہ کی وفات پر ختم ہوگئی۔

تیسرا:

معاون تنفیذ

معاونِ تَـنْـفِیْـذ، خلیفہ کا وہ وزیر ہوتا ہے جسے خلیفہ معاملات کے نفاذ، اُن پر پیش رفت سے باخبری اور اُن کی تعمیل کیلئے تعینات کرتا ہے۔ معاونِ تنفیذ، خلیفہ اور ریاست کے تمام محکمات اور اداروں کے مابین ایک واسطہ (Liaison) ہوتا ہے، نیز وہ خلیفہ اور عوام کی درمیان اور بیرونی ممالک کے درمیان واسطہ ہوتا ہے مزید یہ کہ وہ معاملات کے نفاذ میں خلیفہ کا معاون بھی ہوتا ہے، لیکن وہ معاملات پر والی نہیں ہوتا، نہ ہی معاملات اُسکی صوابدید سے نفاذ کیلئے اس کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا معاون تنفیذ کے کام کی نوعیت انتظامی ہے نہ کہ حاکمیت۔ معاون کا دائرہ عمل خلیفہ کے صادر کردہ احکامات کو اُن کے داخلی اور خارجی محکمات تک پہنچانا اور اِن محکمات سے جاری تحریریں (Correspondence/Records) خلیفہ تک پہنچانا ہے۔ چنانچہ معاون تنفیذ، خلیفہ اور باقی شعبوں کے درمیان رابطہ کا کام کرتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں وزیر تنفیذ کو کاتب کہا جاتا تھا، اس کے بعد اسے رسائل و مکاتبات کا دیوان، پھر کاتبِ ادارہ یا دیوان کاتبِ ادارہ کہا جاتا رہا اور آخر میں فقہا نے وزیر تنفیذ کہا۔

خلیفہ ایک حاکم ہے جس کی ذمہ داریوں میں حاکمیت، احکام کا نفاذ اور امور کی نگہداشت ہوتی ہے۔ اِن تمام افعال کیلئے انتظامیہ یا اداری ڈھانچہ درکار ہوتا ہے جس کا تقاضا ہے کہ خلیفہ کے پاس ایک مخصوص ادارہ ہو جو اِن ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کارآمد ہو۔ لہٰذا یہ

ضروری ہے کہ خلیفہ اپنا معاون مقرر کرے جو انتظامی امور میں خلیفہ کی مدد کرے نہ کہ حکمرانی میں۔ معاونِ تفویض کے برعکس معاونِ تنفیذ کی ذمہ داریوں میں حکمرانی کا کوئی کام نہیں ہوتا؛ معاون تنفیذ نہ تو والیوں کا تقرر کرتا ہے نہ عاملوں کا اور نہ ہی عوام کے امور کا اہتمام معاون تنفیذ کی ذمہ داریوں میں سے ہے، بلکہ اُس کا کام انتظامی امور سے متعلق ہے کہ خلیفہ یا معاون تفویض کے صادر کردہ احکامات کی تنفیذ کرنا، یہی معاون تنفیذ کے عہدہ کے نام کا سبب ہے۔ فقہاء نے اس عہدہ کو ''وزیر تنفیذ'' کہا ہے، جو معاون تنفیذ کے ہم معنی ہے، کیونکہ لفظ ''وزیر'' معاون کے مترادف ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ یہ وزیر؛ خلیفہ، رعایا اور والیوں کے درمیان واسطہ ہے، یہ اُن کاموں کی تعمیل کرتا ہے جس کا اسے حکم دیا جائے یا اُسے بتایا جائے، یہ اُن امور کی تنفیذ کرتا ہے جس کا اسے حکم دیا جائے، یہ والیوں کی تقرری سے ہر متعلقہ فرد یا ادارے کو باخبر رکھتا ہے، فوج یا عسکری دستوں کی تیاری اور بندوبست سے خلیفہ کو آگاہ رکھتا ہے اور اُن کی ضروریات سے باخبر کرتا ہے۔ نئے حالات سے خلیفہ کو باخبر رکھتا ہے تاکہ حسبِ ضرورت خلیفہ اُن کے مطابق احکام جاری کر سکے۔ لہٰذا معاون تنفیذ معاملات کے نفاذ میں مدد کرنے والا ہے نہ کہ اُن معاملات پر حاکم اور نہ ہی امور معاون تنفیذ کی سپردگی میں دیے جاتے ہیں۔ وزیر تنفیذ موجودہ دور کے سیکرٹری کابینہ کی طرح ہے۔

معاون تنفیذ، کا خلیفہ سے براہِ راست تعلق رہتا ہے جس طرح معاون تفویض کا ہوتا ہے اور معاون تنفیذ، خلیفہ کے رفقائے خاص میں ہوتا ہے اور اُس کا کام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ دن و رات کے کسی بھی وقت اکیلے خلیفہ سے ملاقات کرے اور امور کو فالو (follow) کرے، جو ایک ایسا معاملہ ہے جو شرعی احکامات کے مطابق اس کے عورت ہونے سے مناسب نہیں رکھتا۔ پس معاون تنفیذ کے لیے لازم ہے کہ وہ مرد ہو۔ اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ معاون تنفیذ کافر ہو، بلکہ یہ لازمی ہے کہ وہ مسلمان ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ﴾

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اپنے سوا دوسروں کو اپنا محرمِ راز نہ بناؤ؛ وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے؛ جتنا بھی تم زحمت میں پڑو انہیں محبوب ہے۔ ان کا بغض تو ان کے منہ سے ظاہر ہو چکا ہے، اور جو کچھ وہ سینے میں چھپائے ہوئے ہیں وہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہے''

(ال عمران: 118)

اس آیت سے خلیفہ کے رفقائے خاص میں کسی غیر مسلم کے موجود ہونے کی ممانعت واضح ہے، چنانچہ یہ جائز نہیں کہ معاون تنفیذ کافر ہو، اس کا مسلمان ہونا لازمی ہے، کیونکہ وہ خلیفہ کے رفقاء میں سے ہے، اور معاون تفویض کی طرح خلیفہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ معاون تنفیذ ضرورت کے مطابق ایک سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں، یہ اُن اعمال پر منحصر ہے جن میں وزیر تنفیذ کو وساطت کا کام انجام دینا ہو۔

جن امور میں معاون تنفیذ واسطے کا کام کرتا ہے، وہ یہ چار امور ہیں:

1) عالمی تعلقات، خواہ اُن کی نوعیت یہ ہو کہ خود خلیفہ اِن تعلقات کی دیکھ بھال کر رہا ہو، یا اِن امور کیلئے خلیفہ نے مستقل کوئی ادارہ یا محکمہ مخصوص کیا ہو۔
2) فوجی معاملات
3) عسکری اداروں کے علاوہ دیگر محکمات
4) عوام سے تعلقات

یہ معاونِ تنفیذ کے کام کی حقیقت ہے کہ وہ واسطہ ہونے کے سبب خلیفہ تک معاملات پہچانے اور خلیفہ سے دوسروں تک پیغامات یا احکامات پہنچانے کا وسیلہ ہوتا ہے۔ اس میں تمام محکمات کے کام کاج میں پیش رفت پر نظر رکھنا بھی شامل ہے۔

خلیفہ ہی چونکہ اصل حاکم ہوتا ہے، اور خود ہی حکومت کرتا ہے، احکام کا نفاذ کرتا ہے، عوام کے معاملات کی نگہداشت کرتا ہے؛ اور ان سب کیلئے لازم ہے کہ وہ ہر وقت حکومت کے

مختلف محکموں سے تعلق میں رہے، بین الاقوامی حالات سے واقف رہے، اور امت سے منسلک رہے۔ خلیفہ ہی احکامات صادر کرتا ہے، فیصلے کرتا ہے، عوامی امور کی نگہداشت کرتا ہے، اور حکومتی ڈھانچے کی حالت سے، ان کے کام میں دقتوں سے، اُن کی ضروریات سے واقفیت رکھتا ہے، خلیفہ ہی امت کے تمام معاملات اور شکایات کی خبر اور بیرونی حالات پر نظر رکھتا ہے۔ معاون تنفیذ حقیقتاً اِن تمام معاملات میں واسطہ ہوتا ہے، جو خلیفہ تک معاملات پہنچاتا ہے اور خلیفہ سے باقی اداروں یا محکموں کو۔ ظاہر ہے کہ خلیفہ کے فیصلے جو محکمات تک پہنچائے گئے ہوں، یا محکمات سے معاملات جو خلیفہ تک پہنچائے گئے ہوں، اُن کی بہتر کارکردگی کیلئے ضروری ہے کہ ان معاملات اور فیصلوں کی تعمیل کی پیش رفت پر نظر رکھی جائے، اور تعمیل کی پیش رفت پر نظر رکھنا معاونِ تنفیذ کا ہی کام ہے، جب تک کہ تعمیل مکمل نہ ہو جائے۔ اس طرح معاون تنفیذ خلیفہ کے پاس معاملات کی نیز مختلف محکمات کے پاس معاملات کی پیش رفت پر نظر رکھتا ہے تاوقت یہ کہ خلیفہ اُسے ایسا کرنے سے روک دے، اب معاون تنفیذ حکم کے مطابق اس (Follow-up) یا نگرانی کے کام سے رک جاتا ہے کیونکہ بہرحال خلیفہ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم نافذ ہوتا ہے۔

فوجی معاملات اور بین الاقوامی تعلقات سے متعلق امور چونکہ صیغۂ راز میں ہوتے ہیں، اسلئے معاون ایسے معاملات کی تعمیل اور ان کی پیش رفت (Follow-up) پر نظر نہیں رکھتا، تاوقت یہ کہ خلیفہ از خود معاون تنفیذ سے ایسا کرنے کے لیے کہے، ایسی صورت میں معاون صرف انہی معاملات میں تعمیل کی پیش رفت پر نظر رکھ سکتا ہے جس کیلئے خلیفہ نے معاون سے کہا ہو۔

رہے وہ معاملات جو امت سے متعلق ہیں، جیسے امت پر مظالم کا سدِ باب وغیرہ یہ سب خلیفہ یا اس کے نائب کے کام ہیں اور معاون تنفیذ کا ان میں دخل نہیں ہوتا سوائے یہ کہ معاون خلیفہ کے حکم پر ان معاملات کی خبر گیری کرے، ان معاملات میں معاون کا کام کم محض تعمیل ہے نہ کہ اُن کی پیش رفت پر نظر۔ اس بات کا انحصار خلیفہ کے کاموں کی نوعیت پر ہوتا ہے، پس معاون تنفیذ کا کام اسی کے مطابق ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے عہد میں وزیر تنفیذ کے افعال واعمال کی مثالیں یہ ہیں: (اُس عہد میں وزیر تنفیذ کاتب کہلاتا تھا)

1) خارجہ تعلقات اور اس کی مثالیں:

۞ صلح حدیبیہ کے وقت کی مثال ہے، جس کے بارے میں بخاری نے مِسوَر اور مروان کے توسط سے نقل کیا ہے:

((فَدَعا النبی الکاتب...))

''تو نبی ﷺ نے کاتب کو بلایا...''

نیز قاضی ابو یوسف کتاب ''الخراج'' میں لکھتے ہیں:

''محمد ابن اسحٰق اور الکلبی نے مجھے حدیث سنائی جس کے لفظوں میں کچھ فرق تھا اور اُس میں تھا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لکھو...'' اس حدیث میں کاتب کا نام نہیں ہے۔ اسی طرح ابنِ کثیر لکھتے ہیں: ''مجھ سے ابن اسحٰق اور زُہری نے کہا:

((...ثم دعا رسول اللّٰہ علی ابن ابی طالب فقال: أکتب...))

''... پھر رسول اللہ ﷺ نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بلایا اور فرمایا: لکھو...''

نیز ابوعبید نے اپنی کتاب ''الأمـــوال'' میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

((...فقال لِعلی: أکتب یا علی...))

''... پھر آپ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے علی! لکھو...''

اسی طرح حاکم نے بھی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، جس سے ذہبی نے اتفاق کیا ہے نیز اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے، اس روایت میں یہ الفاظ منقول ہیں:

((...اکتب یا علی...))

''... اے علی، لکھو...''۔

صلح حدیبیہ کا متن مشہور ہے اور یہاں اسے دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

۞ رسول اللہ ﷺ کا روم کے بادشاہ ہرقل کے نام مکتوب جسے ابنِ ماجہ کے سوا سبھی محدثین نے روایت کیا ہے، اور ابنِ عباس اور ابوسفیان کی سند سے بخاری کے الفاظ یوں ہیں:

((بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم ،من محمد عبد اللّٰه و رسوله إلى هرقل عظيم الروم،سلام على من اتبع الهدى،أما بعد، فإني أدعوك بدعاية الإسلام ،أسلم تسلم يؤتك اللّٰه أجرك مرتين،فإن توليت فإن عليك اثم الأريسيين ويا أهل الكتاب تعالوا الى كلمة سواء بيننا و بينكم، أن لا نعبد إلا اللّٰه ولا نشرك به شيئاً ، ولا يتخذ بعضنا بعضاً أرباباً من دون اللّٰه، فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون))

''شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے؛ محمد کی طرف سے جو اللہ کا بندہ اور اُس کا رسول ہے، ہرقل عظیم (بادشاہِ روم) کے نام۔ سلامتی ہو اُس پر جو ہدایت کو قبول کرے۔ اما بعد، میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ اسلام کو قبول کرلو، تم محفوظ ہو جاؤ گے اور اللہ تمہیں دوگنا اجر دے گا؛ اور اگر تم نے انکار کیا تو تمہاری قوم کی گمراہی کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔ اے اہلِ کتاب! آؤ، اللہ کے کلمہ کی طرف، جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے اور اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا ربّ نہیں بنائیں گے۔ پھر اگر وہ منہ موڑ لیں تو اے اللہ! تُو گواہ ہے کہ ہم تو اسے قبول کر چکے ہیں''

۞ اس خط کے جواب میں ہرقل نے رسول اللہ ﷺ کے نام خط لکھا۔ ابو عبید نے اپنی کتاب ''الأمـــوال'' میں بکر بن عبداللہ المزنی کے حوالہ سے نقل کیا ہے: ''(ہرقل نے) رسول اللہ ﷺ کو جواباً لکھا کہ اس نے اسلام قبول کرلیا ہے اور آپ ﷺ کو کچھ دینار بھیجے۔ رسول اللہ ﷺ نے خط پڑھ کر فرمایا: اللہ کے دشمن نے جھوٹ کہا، وہ مسلمان نہیں ہے بلکہ وہ نصرانیت پر ہی ہے''۔ حافظ نے ''الفتح'' میں اس مرسل حدیث کو بکر کی روایت سے صحیح بتایا ہے۔

۞ اہلِ منبج کا عمرؓ کو خط اور آپؓ کا اِس پر جواب: قاضی ابو یوسف نے کتاب ''الخراج'' میں نقل کیا ہے: ''عبدالملک بن جریج نے مجھے عمرو بن شعیب کے حوالہ سے بتایا کہ اہلِ منبج، جو کہ سمندر پار بسنے والی ایک قوم تھی اور اہلِ حرب میں سے تھی، نے عمر بن الخطابؓ کو لکھا کہ آپ ہمیں اپنے علاقے میں آ کر تجارت کی اجازت دیجئے اور ہم پر عُشر عائد کیجئے؛ پس عمرؓ نے صحابۂ کرام سے اِس سلسلے میں مشورہ کیا، اور عمرؓ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اہلِ حرب پر عُشر عائد کیا''۔

2) فوج اور اس کے مکتوبات:

۞ ابو بکرؓ کا خالد بن ولیدؓ کے نام خط: قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں لکھتے ہیں: ''خالد بن ولیدؓ کا ارادہ تھا کہ وہ حیرہ کے مقام پر ہی قیام کریں، لیکن اُنھیں ابو بکرؓ کا مکتوب ملا جس میں اُن کے روانہ ہونے کا حکم تھا کہ وہ شام جا کر ابو عبیدہؓ اور مسلمانوں کی مدد کریں...''۔

۞ شام کے فوجیوں کیلئے عمرؓ کا رسد اور مکتوب بھیجنا: امام احمد، ابو حاتم، ابن حبان نے صحیح اسناد سے سماک سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں: ''میں نے عیاض الاشعری سے سنا کہ میں نے یرموک کی جنگ دیکھی، اس میں ہمارے اوپر (یکے بعد دیگرے) پانچ امیر ہوئے: ابو عبیدہ بن جراحؓ، یزید بن ابی سفیان، ابی حسنہ، خالد ابن ولیدؓ اور عیاض، اور یہ وہ عیاض نہیں ہیں جن سے سماک نے روایت کیا ہے۔ عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ جب قتال ہو تو تمہارے اوپر ابو عبیدہ بن جراحؓ امیر ہوں گے؛ ہم نے اُنھیں لکھا کہ موت ہمارے قریب آنے کو بے تاب ہے اور اُن سے مدد طلب کی، عمرؓ نے جواب لکھا کہ مجھے تمہارا خط ملا جس میں تم نے مدد طلب کی ہے، میں تمہیں اُس کا پتہ دوں جو مدد دینے میں زیادہ طاقتور ہے اور اُس کے سپاہی حاضر رہتے ہیں، وہ اللہ سبحانہ تعالیٰ ہے، پس اسی سے مدد طلب کرو، بدر کے دن محمد ﷺ کو مدد ملی تھی اور اُن کی استعداد تم سے کم تھی؛ جب تمہیں میرا یہ مکتوب ملے تو اُن سے قتال کرو اور مجھ سے رجوع مت کرو۔ راوی کہتے

ہیں کہ پھر ہم نے قتال کیا اور دشمن کو ایسی شکستِ فاش دی کہ چار فرسخ (14 میل) تک دشمن کا پیچھا کر کے اسے قتل کیا۔

۞ شام کی فوج نے عمر رضی اللہ عنہ کو مکتوب لکھا کہ ہم نے دشمن کا سامنا کیا، وہ اپنے ہتھیار کو ریشم سے ڈھانک لیتے ہیں جس کی وجہ سے ہم مرعوب ہو جاتے ہیں، تو عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے جوابی مکتوب میں لکھا: ''جس طرح وہ اپنے ہتھیار چھپا لیتے ہیں تم بھی اپنے ہتھیار چھپا لیا کرو''۔ ابنِ تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں یہ بیان کیا ہے۔

3) ریاست کے غیر فوجی محکمات اور اُن کے مکتوبات:

۞ رسول اللہ ﷺ کا معاذ رضی اللہ عنہ کو عُشر کے متعلق خط: یحییٰ بن آدم کتابُ الخراج میں الحکم سے روایت کرتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ نے یمن میں معاذ رضی اللہ عنہ کو اپنا خط بھیجا جس میں لکھا تھا: جس زمین کی آبپاشی آبِ باراں سے ہوئی یا جو کسی نہر سے تَر ہوا، تو اُس پر عُشر (دسواں حصہ) لاگو ہوگا، البتہ جو کنوؤں سے سیراب ہو، اُس پر عُشر کا آدھا ہوگا''۔ اور شعبی سے بھی یہی روایت ہے۔

۞ جزیہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا منذر بن ساوی رضی اللہ عنہ کو خط: قاضی ابو یوسف نے کتابُ الخراج میں ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے منذر بن ساوی رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ جس نے ہماری نماز پڑھی، ہمارے قبلے کی طرف رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا، وہ مسلمان ہے، وہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کے ذمہ میں آ گیا۔ مجوس میں سے جو یہ اختیار کر لے، وہ محفوظ ہے، اور جس نے انکار کیا، تو اُس پر جزیہ ہے۔

۞ ابو بکر رضی اللہ عنہ کا انس رضی اللہ عنہ کو صدقہ عائد کرنے کے متعلق خط، جب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے آپؓ کو بحرین بھیجا تھا: بخاری میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل ہے کہ: ''ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اُنھیں صدقہ عائد کرنے کیلئے لکھا، جس کا اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے حکم دیا ہے...''

۞ عام الرمادۃ یعنی خشک سالی کے برس عمر ؓ کا عمرو بن العاص ؓ کو خط اور ابنِ العاص کا جواب: ابن خزیمہ اپنی صحیح میں، حاکم اپنی مستدرک میں، بیہقی اپنی سنن میں اور ابنِ سعد طبقات میں زید ابن اسلم سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، اور اس روایت کو حاکم نے مسلم کی شرط پر صحیح بتایا ہے کہ عام الرمادۃ میں عرب علاقہ سوکھ گیا تو عمر ؓ نے عمرو بن العاص ؓ کو خط لکھا: ''اللہ کے بندے اور امیر المومنین کی جانب سے عمرو بن العاص کو، تمہیں یہ ذرا فکر نہیں کہ تم اور جو لوگ تمہارے ساتھ ہیں وہ خوب عیش میں ہیں جبکہ یہاں خشک سالی ہے اور میں اور میرے ساتھ لوگ اس کے شکار ہیں، ہمیں مدد پہنچاؤ! اس پر عمرو بن العاص ؓ نے جواب دیا کہ لبیک، لبیک، بس قافلہ آیا ہی چاہتا ہے، اور وہ اتنا طویل ہوگا کہ اُس کا پہلا حصہ جب آپ تک پہنچے گا تو اس کا آخری حصہ یہاں ہوگا! بس میں سمندر پار مال روانہ کرنے کی تدبیر کر رہا ہوں۔

۞ محمد ابن ابی بکر کا علی ؓ کو خط، جو اُنہوں نے مرتدین کے بابت تحریر کیا تھا اور اُس پر علی ؓ کا جوابی خط: ابن ابی شیبہ نے قابوس ابن مخارق سے روایت کیا ہے کہ وہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ علی ؓ نے محمد ابن ابی ابکر کو مصر کا امیر مقرر فرمایا تھا، اُنہوں نے علی ؓ کو لکھ کر زندیقوں کے بارے میں دریافت کیا کہ اُن میں سے بعض سورج اور چاند کی پرستش کرتے ہیں اور کچھ اور دیگر اشیاء کو پوجتے ہیں اور بعض اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں۔ علی ؓ نے اپنے جوابی مکتوب میں لکھا اور اُنہیں حکم دیا کہ جو زندیق اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں اُنھیں قتل کر دیا جائے اور باقیوں کو چھوڑ دیا جائے، وہ جس کی چاہیں عبادت کریں۔

4) وہ مکتوبات جن میں براہِ راست عوام سے خطاب ہے:

۞ رسول اللہ ﷺ کا اہلِ نجران کو پیغام جسے ابو داؤد نے سدّی سے اور انہوں نے ابن عباس ؓ سے روایت کیا ہے اور منذری کہتے ہیں کہ سدی کی اس روایت کی پڑتال کی ضرورت ہے۔ ابو عبید نے الاموال میں ابی المُلیح الھذلی سے اسے روایت کیا ہے، جس کہ آخر پر ہے: ''عثمان بن عفان ؓ اور معیقب ؓ نے اس کی گواہی دی اور تحریر کیا''۔ ابو یوسف نے الخراج میں اسے

روایت کیا ہے اور ذکر کیا ہے کہ اس کے کاتب مغیرۃ بن شعبہ ؓ تھے، اور پھر ابو یوسف نے اہلِ نجران کی طرف ابوبکر ؓ کے خط کا ذکر کیا اور بیان کیا کہ اس کے کاتب مغیرۃ ؓ تھے۔ پھر عمر ؓ کے خط کا ذکر کیا اور بیان کیا کہ اس کے کاتب معیقب ؓ تھے، پھر عثمان کے اہلِ نجران کی طرف خط کا ذکر کیا اور بیان کیا کہ اس کے کاتب ان کے مولا حمران تھے، اور پھر علی ؓ کے خط کا ذکر کیا اور بیان کیا کہ اس کے کاتب عبداللہ بن ابی رافع تھے۔

۞ رسول اللہ ﷺ کا تمیم الدّ اری کو خط: قاضی ابو یوسف کتابُ الخراج میں لکھتے ہیں: تمیم الدّ اری ،جن کا پورا نام تمیم بن اوس ہے اور ان کا لخم سے تعلق ہے، کھڑے ہوئے اور کہا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ، فلسطین میں ہم روم کے پڑوسی ہیں اور وہاں دو شہر ہیں ایک کو حبری اور دوسرے کو عینون کہا جاتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ آپ کو ملکِ شام پر فتح دیتا ہے تو آپ یہ شہر مجھے ہبہ فرما دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ دونوں تمہارے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ پھر آپ یہ تحریر کر دیجئے، رسول اللہ ﷺ نے تحریر کروائی: ''بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم، محمد رسول اللہ کی جانب سے تمیم ابن اوس الدّ اری کے نام، کہ اُن کیلئے حبری اور بیتِ عینون کے پورے کے پورے قریہ ہیں، معہ اُن کے میدانوں، پہاڑوں، کھیتوں، پانی اور مویشیوں کے، نیز اُن کے بعد اُن کے ورثاء کیلئے، کوئی اُن سے اُن کے اس حق میں تنازعہ نہ کرے اور نہ کوئی ظلم کر کے اُن سے چھینے، پھر اگر کسی نے ظلم کیا اور اُن سے کچھ چھینا، تو اُس پر اللہ کی لعنت ہو، اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہو۔ اس مکتوب کو علی ؓ نے تحریر کیا۔

جب ابوبکر ؓ کا زمانۂ خلافت آیا تو آپ ؓ نے بھی اُن کے نام تحریر دی جس میں تھا: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ مکتوب منجانب ابوبکر کے، جو اللہ کے رسول ﷺ کے امین اور دنیا میں اُن کے خلیفہ ہیں، اہل الداری کے نام، کہ کوئی اُن سے حبری اور بیت عینون کے شہر، جو اُن کی ملکیت ہیں، میں ان سے تنازعہ نہ کرے، جس تک یہ حکم پہنچ جائے اور جو اللہ کی اطاعت کرتا ہو، وہ اس معاملہ میں کوئی فساد و شر نہ کرے، اُن کے دروازے پر دو دربان کھڑے کئے جائیں جو اُنھیں کسی بھی شر سے محفوظ رکھیں''۔

خلیفہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ جس قدر ضرورت ہو کاتب مقرر کرے، بلکہ اگر کاتبوں کے تعین کے بغیر کسی کام میں رکاوٹ آ رہی ہو، تو ایسے میں اِن کی تقرری واجب ہو جاتی ہے۔ سیرتِ نبوی لکھنے والوں نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے کم وبیش بیس کاتب تھے، بخاری میں مروی ہے کہ آپ ﷺ نے زید بن ثابت ؓ کو حکم دیا کہ وہ یہودیوں کی عبارت سیکھیں تا کہ جب یہودی آپ ﷺ کو خط لکھیں تو وہ اسے پڑھ کر آپ ﷺ کو سنا سکیں۔ زید بن ثابت ؓ نے یہودیوں کی زبان کو صرف پندرہ دن میں سیکھ لیا تھا۔ ابنِ اسحاق نے عبداللہ بن زبیر ؓ سے نقل کیا ہے: ''رسول اللہ ﷺ عبداللہ بن ارقم بن عبد یغوث سے لکھوایا کرتے تھے اور وہی آپ ﷺ کی جانب سے بادشاہوں کو جواب لکھا کرتے تھے''۔ بیہقی عبداللہ بن عمر ؓ روایت کرتے ہیں: ''رسول اللہ ﷺ کو ایک شخص کا مکتوب پہنچا تو آپ ﷺ نے عبداللہ بن ارقم ؓ سے فرمایا کہ میری طرف سے جواب لکھو۔ اُنہوں نے جواب لکھا اور پھر پڑھ کر سنایا جس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے ٹھیک لکھا اور اچھا لکھا، یا اللہ اس سے راضی ہو جا''۔ محمد بن سعد نے علی ابن محمد المدائنی سے روایت کیا ہے کہ محمد بن مسلمہ نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کو مرۃ کے وفد کے لیے تحریر کیا تھا، جبکہ علی ابن ابی طالب ؓ جب بھی صلح یا معاہدے ہوتے تو اُنھیں تحریر کیا کرتے تھے، معیقیب ابن ابی فاطمہ ؓ مُہرِ نبوت پر متعین تھے۔ بخاری نے تاریخ میں محمد ابن بشار سے نقل کیا ہے، وہ اپنے دادا معیقیب سے روایت کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ کی مہر آہنی تھی جس پر چاندی چڑھی ہوئی تھی اور معیقیب ابن ابی فاطمہ ؓ اُس کے ذمہ دار تھے۔

چوتھا:

والی

والی وہ شخص ہوتا ہے جسے خلیفہ ریاستِ خلافت کی کسی ولایت پر حاکم اور امیر مقرر کرتا ہے۔ ریاستِ خلافت اپنے پورے ملک کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتی ہے اور ہر ایک حصہ ولایت کہلاتا ہے، جبکہ ہر ایک ولایت مزید حصوں پر مشتمل ہوتی ہے جنہیں عمالہ کہا جاتا ہے۔ ہر وہ شخص جو کسی ولایت پر مقرر کیا جاتا ہے وہ امیر یا والی کہلاتا ہے جبکہ وہ شخص جو کسی عمالہ پر متعین ہو وہ عامل یا حاکم کہلاتا ہے۔

ہر عمالہ کی انتظامی لحاظ سے مزید تقسیم کی جاتی ہے اور اِن وحدات (units) کو 'قصبہ' کہا جاتا ہے، پھر ہر قصبہ مزید انتظامی یونٹوں میں تقسیم ہوتا ہے جن میں سے ہر ایک کو حي (Precints) کہا جاتا ہے۔ اِن قصبوں اور حي پر جو ذمہ دار متعین کئے جاتے ہیں اُنھیں مدیر (ڈائریکٹرز) کہا جاتا ہے جن کے کام کی نوعیت انتظامی ہوتی ہے۔

چنانچہ والی حکمران ہوتے ہیں جب انہیں دی گئی ولایت حکمرانی سے متعلق ہو۔ قاموس المحیط میں ہے: ''جس کو کسی جگہ کی وِلایت دی گئی تو گویا اُسے حکومت و اقتدار دیا گیا''۔ چونکہ والی حکمران ہوتے ہیں لہٰذا اُن کیلئے وہی شرائط ہوں گی جو کسی بھی حکمران کیلئے ہوتی ہیں، یعنی یہ لازمی ہے کہ والی مرد ہو، مسلم، آزاد، بالغ، عاقل، عادل اور قادر ہو۔ والی کیلئے لازمی ہے کہ اس کی تقرری خلیفہ یا اُس کا کوئی مخصوص نائب کرے، کیونکہ کسی والی کی تقرری ایک خلیفہ ہی کر سکتا

ہے۔ وِلایت وامارت یا والی اور امیر کے عہدے کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے۔ آپ ﷺ کی طرف سے شہروں پر والی مقرر کیا جانا اور اُنھیں اپنے علاقوں پر حکومت کا حق دیا جانا ثابت ہے۔ آپ ﷺ نے معاذ بن جبل کو الجند پر مقرر فرمایا، زیاد ابن لبید کو حضرموت پر اور ابو موسیٰ الاشعری کو عدن اور زبید کے مقامات پر مقرر فرمایا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ طریقہ تھا کہ آپ جن لوگوں کو بحیثیت والی مقرر فرماتے، اُنھیں ایسے لوگوں میں سے چنتے جن میں حکمرانی کی صلاحیت ہوتی تھی، اور وہ اہلِ علم ہوتے تھے اور اپنے تقویٰ اور نیک کاموں کی وجہ سے مشہور ہوتے تھے۔ آپ ﷺ والیوں کا انتخاب ایسے لوگوں میں سے کرتے جو اُن کے سپرد کئے ہوئے کاموں کو بحسن وخوبی انجام دیں اور لوگوں کے دلوں میں ایمان کو جگائیں اور ریاست کیلئے وفاداری پیدا کریں۔ مسلم میں مروی ہے کہ سلیمان بن بریدہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں: ''جب رسول اللہ ﷺ کسی کو فوج یا کسی فوجی کمان کا امیر مقرر فرماتے تو اسے خاص طور پر اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی نصیحت فرماتے تھے اور اپنے مسلمان ساتھیوں سے اچھا سلوک کرنے کی تلقین کرتے تھے''۔ والی چونکہ ایک ولایت کا امیر ہوتا ہے لہٰذا وہ بھی اسی حدیث کے تحت شامل ہے۔

والی کی معزولی خلیفہ کی صوابدید پر منحصر ہوتی ہے، یا جب اُس ولایت کے عوام یا اُن کے نمائندے والی کے متعلق اپنی ناپسندیدگی یا ناراضی کا اظہار کریں تو والی کو برطرف کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ تبنی کرتے ہیں کہ اہلِ ولایت کی نمائندگی کیلئے اُس ولایت کی ایک مجلسِ ولایت منتخب کی جائے گی جس کے دو اہم مقاصد ہوں: اول: یہ نمائندے چونکہ اس ولایت کے رہنے والے ہیں، وہ وہاں کے حالات کو بہتر سمجھتے ہیں چنانچہ وہ والی کو وہاں کے حالات سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں اور اپنی واقفیت کی بناء پر حکومتی اعمال کی کارکردگی کو بہتر بنانے میں والی کی معاونت کر سکتے ہیں۔ دوم: جب والی کیلئے اس مجلس کی رائے حاصل کرنا لازم ہو تو وہ مجلس سے مشاورت کرے۔ جب مجلس کی اکثریت اپنے والی سے ناراضی کا اظہار کرے تو خلیفہ والی کو برطرف کر دے۔ رسول اللہ ﷺ نے بحرین میں اپنے والی علاء بن حضرمی کو اس لئے معزول کر دیا تھا کیونکہ عبد قیس کے وفد

نے علاء بن حضرمی کی شکایت کی تھی۔ نیز خلیفہ کو یہ بھی اختیار ہوتا ہے کہ وہ والی کو بغیر کسی سبب کے برطرف کردے؛ رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو کوئی سبب بیان کیے بغیر یمن کی ولایت سے معزول کر دیا تھا اور عمر رضی اللہ عنہ بھی والیوں کو کبھی کسی سبب پر یا کبھی بغیر سبب کے برطرف کر دیا کرتے تھے۔ آپؓ نے زیاد بن ابی سفیان کو بغیر کسی سبب کے معزول کیا، پھر آپؓ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اس لئے برطرف کیا کہ لوگوں نے اُن کی شکایت کی تھی اور آپؓ نے اس بارے میں فرمایا: ''کہ میں نے اُنھیں کسی خیانت یا نااہلی کی بنیاد پر معزول نہیں کیا ہے''۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ خلیفہ کو اختیار ہے کہ وہ جب چاہے والی کو برطرف کرسکتا ہے نیز یہ کہ اُس پر واجب ہے کہ وہ اُس ولایت کے لوگوں کی شکایت پر والی کو برطرف کردے۔

ابتدا میں وِلایت کی دو قسمیں ہوا کرتی تھیں: وِلایتِ صلاۃ اور وِلایتِ خراج؛ لہٰذا تاریخ کی کتابوں میں دو علیحدہ اصطلاحات کا استعمال نظر آتا ہے: ایک امارت علی الصلاۃ اور دوسرا امارت علی الصلاۃ والخراج، یعنی ایک امیر یا تو صلاۃ اور خراج دونوں کا امیر ہوگا یا صرف صلاۃ، یا صرف خراج کا امیر ہوگا۔ یہاں وِلایت یا امارت میں صلاۃ سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ شخص صرف نماز میں لوگوں کی امامت کا امیر ہوا، بلکہ یہ کہ وہ سوائے امورِ مالیات کے ہر امور میں اُن کا والی ہے۔ لفظِ صلاۃ کا اطلاق اموال کی وصولی کے سوا، حکومت کے ہر شعبہ پر ہوتا تھا۔ جب کوئی والی صلاۃ وخراج دونوں کا والی ہوتا، تو وہ والیٔ عام کہلاتا تھا، لیکن اگر اُس کی وِلایت صرف صلاۃ یا صرف خراج پر ہوتی تو وہ والیٔ خاص کہلاتا تھا۔ وِلایتِ خاص کے یہ تمام امور خلیفہ کی اپنی ترتیب اور صوابدید پر منحصر ہوتے ہیں کہ وہ مناسب سمجھے تو کسی والی کو خراج پر مقرر کردے یا قضاء کیلئے مخصوص کرے، یا کسی والی کو مالیات، قضاء اور عسکری امور کے ماسوا دیگر معاملات کیلئے متعین کرے۔ خلیفہ کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ ریاستِ خلافت یا اُس ولایت کے بہتر انتظام کیلئے جس ترتیب کو مناسب سمجھے اُس کے مطابق عمل کرے کیونکہ شریعت نے والی کیلئے بعض افعال طے کئے ہیں لیکن یہ لازم نہیں کیا کہ وہ تمام حکومتی معاملات کا ہی ذمہ دار ہو۔ شریعت نے امیر یا والی کیلئے یہ کام طے کر دیا ہے کہ وہ حکومت واقتدار کا ذمہ دار ہے، خلیفہ کا نائب ہے اور اُس کا دائرہ عمل ایک مخصوص

مقام ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس شریعت نے خلیفہ کیلئے یہ اختیار رکھا ہے کہ وہ ولایتِ عام یا ولایتِ خاص، جیسا وہ مناسب سمجھے، کسی والی کو سونپے اور یہ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے عیاں ہے: آپ ﷺ نے والیٔ عام مقرر کئے جیسے عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو یمن کا والیٔ عام بنایا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے والیٔ خاص مقرر فرمائے، چنانچہ علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو یمن میں قضاء کا والیٔ خاص بنایا۔ سیرت ابنِ ہشام میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فروۃ بن مسیک کو مراد، زبید اور مذحج کے قبیلوں پر اور اُن کے ساتھ خالد بن سعید بن العاص کو صدقات پر مقرر فرمایا، نیز یہ بھی وارد ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے زیاد بن لبید الانصاری کو حضرموت کے صدقات پر مقرر فرمایا۔ اسی طرح حاکم نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے علی ابن علی طالب رضی اللہ عنہ کو نجران سے صدقات اور جزیہ کی وصولی پر مامور فرمایا نیز اُنھیں یمن کا قاضی بھی بنایا۔ نیز اس میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو لوگوں کو قرآن سکھانے، شریعتِ اسلامی کی تعلیم دینے اور لوگوں کے فیصلے کرنے کیلئے مقرر فرمایا اور اُنھیں وہاں کے عمّال سے صدقات وصول کرنے کا اختیار بھی سونپا۔

گو کہ خلیفہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی والی کو ولایتِ عام یا ولایتِ خاص دے، لیکن عباسی خلافت کے دوران جب کمزوریاں پیدا ہوگئیں تو یہ بات واضح ہوئی کہ وِلایتِ عام کا دیا جانا صوبوں کی خودمختاری کا سبب بنا، یہاں تک کہ خلیفہ کا اقتدار سمٹ کر محض دعاؤں میں اُس کا نام لیے جانے اور سِکّوں پر اُس کا نام کنداں کیے جانے تک محدود ہو کر رہ گیا۔ بالفاظِ دیگر وِلایتِ عام دیا جانا اسلامی ریاست کیلئے نقصان دہ ثابت ہوا۔

لہٰذا چونکہ ولایتِ عامہ دیا جانا اور ولایتِ خاص دیا جانا جائز ہے اور چونکہ ولایتِ عام دیا جانا ریاستِ اسلامی کیلئے ضرر اور خطرے کا باعث بنا، چنانچہ ہم یہ تبنی کرتے ہیں کہ ہر والی کو ولایتِ خاص ہی دی جائے گی اور اس میں وہ امور شامل نہیں ہوں گے جو کسی والی کے ناقص تقویٰ کے باعث اس والی کے خلیفہ سے الگ و خودمختار ہو جانے کا سبب بنیں؛ حقیقت کا جائزہ لینے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ امور فوج، عدلیہ اور مالیاتی امور ہیں۔ پس یہ محکمات دیگر محکمات سے جدا

ہوں گے اور خلیفہ خود اُن کی نگرانی کرے گا، جس طرح وہ ریاست کے دیگر محکمات کی دیکھ بھال کرتا ہے، اور والی کا اِن امور میں دخل نہیں ہوگا۔

والی کا تبادلہ ایک ولایت سے دوسری ولایت میں نہیں ہوتا بلکہ اُسے ایک ولایت سے برخواست کر کے دوبارہ کسی اور ولایت کا والی بنایا جاتا ہے؛ کیونکہ رسول اللہ ﷺ والیوں کو برطرف تو فرماتے تھے لیکن اُن سے کسی والی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جانا منقول نہیں ہے۔ پھر مزید یہ کہ وِلایت ایک عقد ہوتا ہے جس کیلئے متعین اور صریح الفاظ ہیں، اور اس عقد میں والی کو کسی مقام پر متعین کیا جاتا ہے تو اُس مقام کو مخصوص کر دیا جاتا ہے جہاں اسے حکومت کرنا ہے۔ والی کا یہ اختیار اُس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک خلیفہ اُسے معزول نہ کر دے، یعنی جب تک والی معزول نہ کر دیا جائے وہ والی رہتا ہے۔ اگر کسی والی کو اُس کے پہلے مقام سے برطرف کئے بغیر دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے تو اس کی ولایت برقرار رہے گی اور اگر اِس نئے مقام کیلئے اُس کی تقرری نہ کی جائے جہاں اُس کا تبادلہ کیا جانا مطلوب ہے تو اسے نئے مقام کی ولایت حاصل نہیں ہوگی۔ والی کو اُس کے پہلے مقام سے علیحدہ کرنے کیلئے صریح الفاظ میں اُسے ولایت سے برطرف کرنا ضروری ہے اور نئے مقام کیلئے نئے سرے سے صریح الفاظ میں اس نئے مقام کے تعین کے ساتھ اُس کی تقرری کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا اس سے یہ بات ماخوذ ہوتی ہے کہ والی کو ایک مقام سے دوسرے مقام منتقل نہیں کیا جائیگا، بلکہ اسے سابقہ مقام سے معزول کر کے دوبارہ سے دوسری جگہ کیلئے مقرر کیا جائے گا۔

خلیفہ پر لازم ہے کہ وہ والیوں کے کام کی جانچ پڑتال کرے:

خلیفہ کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے والیوں کے اعمال سے واقف رہے اور اُن کی کارروائیوں پر گہری نظر رکھے، خواہ وہ یہ بذاتِ خود کرے یا اِس کیلئے اپنے نائب مقرر کرے۔ اسی نہج پر معاون کی بھی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ جن ولایات پر مامور ہے، وہاں کے والیوں کے کام پر نظر رکھے اور خلیفہ کو والیوں کے احوال سے آگاہ کرے۔ اس طرح خلیفہ اپنے والیوں کے

احوال سے آگاہ رہتا ہے اور اُن کے افعال کی نگرانی کرتا ہے۔ نیز خلیفہ کو چاہئے کہ وہ وقتاً فوقتاً تمام والیوں کو یا بعض والیوں کو جمع کرے اور عوام کی شکایات کی سماعت کرے۔

رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ والیوں کو جانچتے اور پرکھتے تھے، جیسا کہ آپ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور ابوموسی الاشعری رضی اللہ عنہ کے ساتھ فرمایا، نیز اُنہیں سمجھاتے کہ انہیں اپنا کام کس طرح سرانجام دینا ہے جیسا کہ عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا، یا انھیں اُن کے اہم امور کی یاد دہانی فرماتے جیسا کہ آپ ﷺ نے ابان بن سعید کو بحرین کا والی مقرر کرتے وقت اُنھیں ہدایت کی تھی:

((استوص بعبد القيس خيراً و أكرم سراتهم))

''عبدقیس کا خیال رکھنا اور اُن کے سرداروں کا اکرام کرنا''

نیز یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ والیوں کے احوال کی خبر گیری کرتے تھے اور اُن کا محاسبہ فرماتے تھے اور اُن کی جو خبریں آپ ﷺ تک پہنچتیں، انہیں بغور سنتے تھے اور اُن سے آمدنی اور اخراجات کا حساب لیا کرتے تھے، چنانچہ بخاری اور مسلم نے ابوحمید ساعدي رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

((أن النبي ﷺ استعمل ابن اللُّتبيَّة على صدقات بني سليم فلما جاء و حاسبه قال هذا الذي لكم و هذه هدية أهديت لي،فقال رسول اللّٰه ﷺ فهلاّ جلستَ في بيت أبيك و بيت أمك حتى تأتيك هديتك إن كنت صادقاً))

''آپ ﷺ نے بنی سلیم کے صدقات پر ابن التبیہ کو مامور فرمایا، جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اُس سے حساب لیا گیا تو اس نے کہا کہ یہ آپ ﷺ کیلئے ہے اور یہ (حصہ) مجھے تحفے کے طور پر ملا ہے، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تم سچے ہو تو کیوں نہ تم اپنے باپ اور اپنی ماں کے گھر ہی بیٹھے رہتے اور پھر دیکھتے کہ کیا وہاں پر تمہیں یہ تحفہ ملتا ہے''

اسی طرح عمر رضی اللہ عنہ بھی والیوں کی خبر گیری سختی سے کیا کرتے تھے، اُنہوں نے محمد بن مسلمہ

کو والیوں کے احوال سے باخبر رہنے اور اُن پر تفتیش کی غرض سے مقرر فرمایا تھا اور حج کے موسم میں تمام والیوں کو اُن کے احوال جاننے اور رعایا کی شکایتوں کو سننے کیلئے طلب فرمایا کرتے تھے تا کہ ولایتوں کے معاملات پر غور کریں اور اُن کے حالات سے باخبر ہوں۔ آپؓ کے بارے میں مروی ہے کہ ایک دن اُنہوں نے اپنے آس پاس لوگوں سے پوچھا کہ اگر میں تم میں سے بہتر شخص کو تمہارے اوپر مقرر کردوں جو عدل سے کام لے، تو کیا میں نے اپنی ذمہ داری پوری کردی؟ لوگوں نے کہا ''ہاں''۔ عمرؓ نے فرمایا: نہیں! جب تک کہ میں اُس کے کام کو دیکھ نہ لوں کہ کیا اُس نے ویسا ہی کیا ہے جو اسے حکم دیا گیا تھا! عمرؓ اپنے والیوں اور عاملوں سے حساب لینے میں سخت تھے، اور بعض اوقات تو صرف شبہ کی بنیاد پر، ایسا شبہ جو دلیل کے درجے تک نہیں پہنچتا تھا، کسی کو معزول بھی کردیا کرتے تھے۔ ایک بار آپؓ سے اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ آسان ہے کہ قوم کی بھلائی کیلئے ایک امیر کی جگہ دوسرا امیر مقرر کردیا جائے۔ اپنی اس سختی کے باوجود عمرؓ والیوں کو اپنے کام کیلئے پوری چھوٹ دیتے تھے اور اُن کی عزت و رتبہ کی حفاظت کرتے تھے، اُن کی بات سنا کرتے تھے اور اُن کی دلیل پر غور کرتے تھے، اور جب کسی کی دلیل پسند آتی، تو اپنی پسندیدگی کو چھپاتے بھی نہیں تھے بلکہ بعد میں اس کی تعریف بھی کرتے۔ ایک بار عمرؓ کو خبر ملی کہ حمص میں اُن کے عامل عمیر بن سعد نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا:

(لا يزال الإسلام منيعاً ما اشتدَّ السلطان. و ليست شِدَّة السلطان قتلاً بالسيف أو ضرباً بالسوط، ولكن قضاءً بالحق و أخذاً بالعدل)

''اسلام اس وقت تک مضبوط رہے گا جب تک اس کا اقتدار مضبوط رہے۔ اور اقتدار کی مضبوطی تلوار سے قتل کرنے اور کوڑے سے مارنے میں نہیں، بلکہ حق کو قائم رکھنے اور عدل سے فیصلے کرنے میں ہے''

عمرؓ نے جب یہ سنا تو فرمایا:

(وددت لو أن لي رجلاً مثل عمير بن سعد أستعين به على أعمال المسلين)

''کاش میرے پاس کوئی عمیر بن سعد جیسا ہوتا جو مسلمانوں کے اُمور میں میری مدد کرتا''

جہاد

جہاد اسلام کی عظمت کی چوٹی ہے اور یہی وہ طریقہ ہے جو اسلام نے اپنی دعوت کو دنیا تک پھیلانے کیلئے متعین کیا ہے۔ اسلامی احکامات کو ریاست کے اندر مکمل طور پر نافذ و جاری کرنے کے بعد یہی ریاست کا اصل اور بنیادی کام ہے۔

چونکہ جہاد اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اللہ کی راہ میں قتال کا نام ہے، جس کیلئے فوج کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور فوج کے لیے فوجی قیادت، چیف آف سٹاف، فوجی افسران اور سپاہیوں کی تشکیل ضروری ہے۔ اسی طرح فوج کی تیاری، تربیت اور رسد بھی لازمی ہے۔ اور یہ بھی لازمی ہے کہ فوج ہتھیاروں سے لیس ہو، جس کیلئے صنعت از حد ضروری ہے۔ لہٰذا صنعت فوج اور جہاد کیلئے ناگزیر ہے؛ چنانچہ یہ واجب ہو جاتا ہے کہ ریاست کے تمام کارخانے جنگی ساز وسامان کی تیاری کی بنیاد پر قائم ہوں۔

اسی طرح ریاست کی داخلی صورتِ حال فوج کے قتال کے عزم پر اثر انداز ہوتی ہے؛ اگر ملک میں داخلی امن مستحکم نہ ہو تو فوج کو جہاد سے قبل اس صورتِ حال سے نمٹنا پڑتا ہے اور اگر وہ جہاد کیلئے نکل بھی پڑیں اور اُن کے پیچھے داخلی امن بگڑ جائے تو یہ صورتِ حال فوج کے جہاد کو جاری رکھنے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

مزید یہ کہ اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ وہ دیگر ممالک میں اسلام کی دعوت کو پہنچائے۔

چنانچہ اس بنیاد پر یہ کیا جا سکتا ہے کہ فوج، داخلی امن، صنعت اور خارجہ امور، یہ چاروں محکمات ایک ہی محکمہ کے تحت ہوں جن پر خلیفہ ایک ہی امیر مقرر کرے، کیونکہ بہر حال اِن سب کا تعلق بنیادی طور پر جہاد سے ہے۔ اور اِن چاروں محکموں کو علیحدہ رکھنا بھی صحیح ہے جن پر خلیفہ الگ الگ ذمہ دار ہو اور فوج کیلئے علیحدہ امیر یا قائد مقرر کرے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ فوج کیلئے امیر مقرر فرماتے تھے جنہیں مثلاً صنعت کے معاملات سے کوئی سروکار نہ ہوتا تھا بلکہ آپ ﷺ یہ ذمہ داری دوسروں کو سونپا کرتے تھے۔ یہی صورت داخلی امن کی ہے، جس میں شرطہ (Police)، گشت (Patrol)، راہزنی اور چوریوں کی روک تھام وغیرہ شامل ہیں۔ اور یہی معاملہ خارجی تعلقات کا ہے، جیسے رسول اللہ ﷺ نے بادشاہوں اور حکام کو خطوط ارسال فرمائے۔

مندرجہ ذیل دلائل سے اِن چاروں محکموں کا علیحدہ علیحدہ ہونا اور اُن کا اپنا الگ ذمہ دار ہونا ثابت ہوتا ہے:

1) فوج:

۞ رسول اللہ ﷺ نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مؤتہ کی جنگ میں امیر مقرر فرمایا اور ساتھ ہی اُن کے شہید ہو جانے کی صورت میں دیگر امراء کا بھی تعین کر دیا، طبقات ابنِ سعد میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((امیر النّاس زید ابن حارثة،فإن قتل فجعفر بن ابی طالب،فإن قتل فعبد اللّٰه بن رواحة ، فإن قتل فلیرتض المسلمون بینهم رجلاً فیجعلوه علیهم))

''لوگوں کے امیر زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہوں گے، اگر وہ شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ امیر ہوں گے اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ امیر ہوں گے اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان اپنی رضا سے اپنے اوپر کسی کو امیر بنالیں...''

بخاری نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں: ''مؤتہ میں رسول

اللہ ﷺ نے زید کو امیر مقرر فرمایا''۔ ایسی ہی روایت بخاری میں سلمہ ابن الاکوع ؓ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں: ''میں زید کے ساتھ لڑائی میں شریک تھا اور اُنھیں امیر بنایا گیا تھا''۔ نیز بخاری اور مسلم دونوں نے عبداللہ بن عمر ؓ سے روایت کیا ہے:

((بعث النبی ﷺ بعثاً ، وَّ اَمَّرَ علیھم اسامة بن زیدٍ ، فَطُعِنَ بعض الناس فی اِمارتہٖ ، فقال النبی ﷺ : اِن تَطعُنُوا فی اِمارتہٖ فَقَد کنتم تَطعُنون فی اِمَارة اَبیہ من قبل، وَ اَیمُ اللّٰہِ اِن کانَ لَخَلِیقًا للامارة...))

''رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر روانہ کیا اور اس کا امیر اسامہ بن زید ؓ کو مقرر فرمایا تو اُن کی امارت پر اعتراض کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم اس کی امارت پر اعتراض کرتے ہو، اور تم اس سے پہلے اسامہ کے والد کی امارت پر بھی اعتراض کر چکے ہو، حالانکہ اللہ کی قسم! وہ امارت کیلئے موزوں تھے''

صحابۂ کرام مؤتہ کی فوج کو امراء کی فوج کہا کرتے تھے، مسلم میں بردہ سے روایت ہے :''جب آپ ﷺ کسی فوج یا لشکر پر امیر مقرر فرماتے تو اُنھیں ہدایات دیا کرتے تھے...''۔

۞ ابو بکر ؓ نے مرتدین سے نمٹنے کیلئے یرموک کی لڑائی میں خالد بن ولید ؓ کو مقرر کیا۔ ابوبکر ؓ نے فرمایا: خالد ؓ کو تمام لوگوں کا عمومی امیر مقرر کیا جاتا ہے، جبکہ ثابت بن قیس بن شماس انصار کے امیر ہوں گے اور اُن سب کے اوپر خالد ؓ ہوں گے۔ ابوبکر ؓ نے شام کی فوجوں کو یرموک میں خالد ؓ کی کمان میں رکھا۔ ابن جریر نے بیان کیا ہے: ''اُنھیں (خالد کو) پیغام بھیجا کہ وہ عراق سے شام جائیں اور وہاں کی فوجوں کے بھی وہی امیر ہوں گے''۔ اسی طرح عمر ؓ نے شام کی فوجوں کو ابوعبیدہ ؓ کی امارت میں جمع کیا۔ ابنِ عساکر لکھتے ہیں: ''وہ یعنی ابو عبیدہ ؓ پہلے شخص تھے جنھیں شام میں امیر الامراء کا نام دیا گیا''۔

2) داخلی امن:

امام بخاری نے انس ؓ سے روایت کیا ہے:

((أن قيس ابن سعد كان يكون بين يَدَي النبي بمنزلةِ صاحب الشُرَطِ من الأمير))

''قیس بن سعد رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس طرح رہتے تھے جیسے ایک امیر کے ساتھ رئیسِ شرطہ ہوتا ہے''

یہ قیس بن سعد الانصاری خزرجی رضی اللہ عنہ تھے، نیز ترمذی میں روایت ہے:

((كان قيس بن سعد من النبى بمنزلة صاحب الشرطةمن الأميرِ. قال الأنصارى:يعنى مما يلي من اموره))

قیس بن سعد رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس طرح رہتے تھے جیسے ایک امیر کے ساتھ رئیسِ شرطہ ہوتا ہے،

الانصاری نے بیان کیا: یعنی وہ ان کے امور کو سرانجام دیا کرتے تھے''۔

ابنِ حبان نے اس حدیث کے بیان میں لکھا ہے:

(احتراز المصطفى من المشركين فى مجلسهٖ إذا دخلوا)

''یہ تقرری اس لئے تھی کہ آپ ﷺ کو مشرکوں سے محفوظ رکھا جائے، جب وہ آپ کی مجلس میں داخل ہوں''

بخاری نے علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے:

(بعثنى رسول الله ﷺ والزبير و ابا مرثد، وكلنا فارس، قال:انطلقوا حتى تأتوا روضة حاج ، هكذا قال ابو عوانة حاج، و فى روايةٍ خاخ ، فإن فيها امرأة معها صحيفه من حاطب بن ابى بلتعة إلى المشركين ، فأتوني بها، فانطلقنا على افراسنا حتى أدركناها ، حيث قال لنا رسول الله ﷺ تسير على بعير لها ، و قد كان كتب إلى أهل مكة بمسير رسول الله ﷺ إليهم. فقلنا: أين الكتاب الذى معكِ؟ قالت:ما معي كتاب. فأنخنا بها بعيرها، فابتغينا فى رحلها فما وجدنا شيئاً. فقال صاحباي: ما نرى معها كتاباً. فقلت:لقد علمنا ما كذب رسول الله ﷺ، ثم حلف علي: والذى يحلف به لتُخرجنَّ الكتاب أولأجردنَّك. فأهوت

إلی حجزتها، وهی محتجزة بکساء،فأخرجت الصحیفة فأتوا بها رسول اللّٰہ ﷺ.....الحدیث)

''رسول اللہ ﷺ نے مجھے، زبیر اور مقداد بن اسود کو بلوایا، ہم سب کے پاس گھوڑے تھے اور فرمایا کہ حاج کے باغ جاؤ، ابوعوانہ کی روایت میں حاج کا لفظ ہے جبکہ ایک اور روایت میں خاخ کا باغ ہے، وہاں تمہیں ایک عورت ملے گی جس کے پاس ایک تحریر ہوگی جو حاطب بن ابی بلتعہ نے مشرکوں کو لکھی تھی، وہ تحریر مجھے لا کر دو۔ لہٰذا ہم لوگ نکلے اور اُس عورت تک جا پہنچے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بتایا تھا، وہ اپنے اونٹ پر تھی۔ ہم نے اُس سے کہا کہ وہ تحریر کہاں ہے جو تمہارے پاس ہے؟، اُس نے کہا کہ میرے پاس کوئی تحریر نہیں ہے، ہم نے اسے اسکے اونٹ سے اتارا اور اُس کے سامان کی تلاشی لی لیکن ہمیں وہ تحریر نہیں ملی۔ میرے دونوں ساتھیوں نے کہا کہ ہمیں اُس کے پاس کوئی تحریر نہیں مل رہی۔ میں نے کہا کہ ہمیں اللہ کے رسول ﷺ نے بتایا ہے اور یہ جھوٹ نہیں ہوسکتا۔ پھر علی رضی اللہ عنہ نے حلفاً کہا کہ تحریر دے دو ورنہ تمہاری جامہ تلاشی لیں گے، تو اُس عورت نے اپنی چوٹی میں سے وہ تحریر نکال کر دی جسے ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آئے''

3) صنعت:

بیہقی نے سنن میں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منجنیق اور بکتر بند ڈھانچہ بنانے کا حکم دیا، وہ کہتے ہیں:

((ثم إن رسول اللّٰہ ﷺ حاصر اهل طائف و نصب علیهم المنجنیق سبعة عشر یوماً))

''پھر رسول اللہ ﷺ نے طائف والوں کا محاصرہ کیا اور اُن پر سترہ دن منجنیق نصب کیے رکھی''

ابوداؤد نے المراسیل میں مکحول سے روایت کیا ہے:

((أن النبی ﷺ نصب المنجیق علی أهل طائف))

''کہ رسول اللہ ﷺ نے اہلِ طائف پر منجنیق نصب کر دی''

صنعانی نے اپنی کتاب سُبل السلام میں اس روایت کے رجال کو ثقہ بتایا ہے۔
سیرۃ حلبیہ کے مصنف لکھتے ہیں:

(أرشده إليه سلمان الفارسی ﷺ قال: كنا بأرض فارس ننصب المنجنيقات على الحصون، فنصيب من عدونا. و يقال إن سلمان ﷺ هو الذی عمله بيده)

''سلمان الفارسی ﷺ نے ہی رسول اللہ ﷺ کو منجنیق کی تجویز پیش کی تھی اور کہا تھا کہ جب ہم ایران میں تھے تو ان ہی کے ذریعے قلعوں پر حملہ کرتے تھے اور دشمن پر نشانہ لگاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سلمان ﷺ نے ہی خود اپنے ہاتھوں سے یہ منجنیق بنائی تھیں۔

ابن قیم اپنی کتاب زاد المعاد میں اور ابنِ ہشام اپنی سیرۃ میں ابن اسحٰق سے روایت کرتے ہیں: ''جس دن طائف کی دیوار کو اُڑایا گیا، تو رسول اللہ ﷺ کے کچھ لوگ بکتر بند ہو کر داخل ہوئے اور دیوار کو جلانے کیلئے اُس کی طرف بڑھے۔ اس پر بنوثقیف نے لوہے کی سلاخوں کے ذریعے اُن پر آگ پھینکی اور وہ لوگ بکتر بند کے نیچے سے بھاگے، پھر بنوثقیف نے اُن پر تیر برسائے اور کچھ کو شہید کر دیا۔

یہ سلمان ہی تھے جنھوں نے منجنیق کا رخ دیوار کی جانب کیا تھا اور بیان کیا گیا ہے کہ یہ منجنیقیں بھی اُنھوں نے ہی بنائی تھیں، جو ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حکم سے ہی بنائی گئی تھیں۔ اب **سیرۃ الحلبیۃ** کے اس فقرہ کو دیکھئے (**ارشدہ إلیہ**) یعنی سلمان ﷺ نے منجنیق کی یہ تجویز آپ ﷺ کو دی تھی۔ اس روایت سے یہی مفہوم اخذ ہوتا ہے کہ اسلحہ سازی خلیفہ ہی کی ذمہ داری ہے، اور وہ اس کام میں اپنی مدد کیلئے جسے چاہے مقرر کر سکتا ہے۔ پھر یہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جس کیلئے کسی امیر کا ہونا ناگزیر ہو، بلکہ یہ کام کسی افسر کی سرکردگی میں ہو سکتا ہے، لہٰذا سلمان ﷺ فوجی صنعت کے امیر نہیں تھے بلکہ منجنیق سازی کے افسر تھے اور بہت ممکن ہے کہ یہ کام اُنھوں نے اپنے ہی ہاتھوں سے انجام دیا ہو۔ فوجی مصنوعات کیلئے کارخانے بنانا ایک فریضہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق دشمن کے دلوں میں رعب و دہشت ڈالنا مطلوب ہے:

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ

عَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ﴾

''اور جو بھی تم سے ہو سکے ان کیلئے طاقت اور بندھے گھوڑے تیار رکھو تا کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں اور ان کے علاوہ اور دوسروں پر بھی اپنی ہیبت قائم کر سکو جنہیں تم نہیں جانتے، مگر اللہ ان کو جانتا ہے'' (انفال:60)

یہ رعب و دہشت بغیر استعداد اور تیاری کے ممکن نہیں اور ایسی تیاری کیلئے کارخانے ناگزیر ہیں، لہٰذا یہ آیت دلالتِ التزام کی بناء پر یہ لازم قرار دیتی ہے کہ ایسے کارخانے ہوں۔ پھر مزید یہ کہ اس شرعی قائدے: (**مالا یتم الواجب إلا بہٖ فھو واجب**) یعنی ''جس کے بغیر کوئی فریضہ پورا نہ ہوتا ہو، تو وہ چیز بھی فرض ہوتی ہے''، کی رُو سے بھی ایسے کارخانوں کا ہونا لازمی قرار پاتا ہے۔ نیز جہاد کے فرض ہونے کے دلائل بھی ایسے کارخانوں کی موجودگی کو ناگزیر بناتے ہیں۔

یہ کارخانے جنہیں قائم کرنا اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، محض عسکری نوعیت ہی کے نہیں ہیں، بلکہ اِن کے علاوہ دیگر کارخانے قائم کرنا بھی ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ کتاب ''**الأموال فی دولة الخلافة**'' ریاستِ خلافت کی مالیات، میں ہم نے یہ بیان کیا:

''**کارخانے**: عوامی مفاد کے پیشِ نظر ریاست پر یہ واجب ہوتا ہے کہ وہ دو اقسام کے کارخانے قائم کرے:

پہلی قسم: وہ کارخانے جن کا تعلق ملکیتِ عامہ سے ہے یعنی معدنیات کے نکالنے، اُن کی صفائی اور پگھلانے، یا خام تیل کو نکالنے اور اُس کی صفائی کے کارخانے۔ ایسے کارخانے ملکیتِ عامہ میں ہوں گے اور یہ اس امر پر منحصر ہے کہ وہاں کیا مواد بنائے جا رہے ہیں۔ چونکہ ملکیتِ عامہ کے مالک تمام مسلمان ہوتے ہیں، لہٰذا ایسے کارخانوں کی ملکیت تمام مسلمانوں کی ہوگی جنھیں ریاست تمام مسلمانوں کی نائب ہونے کی حیثیت سے قائم کرے گی۔

دوسری قسم: وہ جو بھاری صنعت سے اور اسلحہ سازی سے متعلق ہے۔ اس دوسری قسم کے کارخانے

انفرادی ملکیت میں ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ انفرادی ملکیت کے تحت ہی آتے ہیں۔ البتہ چونکہ ایسے کارخانوں اور صنعتوں کے لیے کثیر مالیات درکار ہوتی ہیں جو افراد کیلئے دشوار ہو سکتا ہے، اور چونکہ آج کے دور میں بھاری اسلحہ ایسے اسلحے میں شمار نہیں ہوتا کہ افراد جس کے مالک ہوں، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے یا آپ ﷺ کے بعد خلفاء کے دور میں معاملہ تھا، بلکہ اب یہ ریاستی ملکیت بن گیا ہے، لہٰذا اسے ریاست ہی مہیا کرے گی، اور ریاست کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کا انتظام کرے۔ اور خاص طور پر اب جبکہ اسلحہ کی صنعت نے حیرت انگیز اور بے پناہ ترقی کر لی ہے اور اس کے اجزاء نہایت مہیب الہیکل اور بے پناہ مہنگے ہو گئے ہیں۔ اس لئے ریاست پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ بھاری صنعت اور اسلحہ سازی کے کارخانے قائم کرے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ افراد کو ایسے کارخانے قائم کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔''

پس ایسے کارخانے قائم کرنا ریاست پر فرض ہے یعنی یہ خلیفہ کے فرائض میں شامل ہے، جس کیلئے وہ کسی ڈائریکٹر کو مقرر کر سکتا ہے جو ان کی براہِ راست نگرانی کرے یا اُس کا کوئی اور نائب یہ کام انجام دے۔

4) بین الاقوامی تعلقات:

جیسا کہ ذکر گزرا، یہ وزیرِ تنفیذ کی ذمہ داریوں میں شامل ہے کہ وہ بین الاقوامی تعلقات کے سلسلے میں خلیفہ اور دیگر ممالک کے درمیان ایک واسطہ ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے عہد میں اور آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین ؓ کے دور میں، آپ ﷺ نے اور بعد میں خلفائے راشدین ؓ نے یہ کام بذاتِ خود کاتب یعنی وزیرِ تنفیذ کے توسط سے سرانجام دیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے مراسلات بذاتِ خود لکھوائے اور صلح کا معاہدہ کیا، یا جیسا عمر ؓ کے بارے میں آتا ہے کہ جب کسریٰ کے نمائندے نے مدینہ آ کر اُن کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے آپؓ کو مدینہ منورہ کے داخلے کے راستے میں سوتے ہوئے پایا۔

البتہ جس طرح خلیفہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ بین الاقوامی تعلقات براہِ راست ایک وزیر تنفیذ کے توسط سے سنبھالے، خلیفہ کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اس کام کیلئے کسی مستقل عہدیدار کو متعین کرے جیسا کہ ریاست کے دوسرے محکمات کیلئے کیا جاتا ہے۔

لیکن بہرحال یہ ممکن ہے کہ یہ چاروں محکمات (شعبۂ جنگ، شعبۂ صنعت، شعبۂ داخلی امن، شعبۂ عالمی تعلقات) ایک ہی محکمہ یعنی امیر جہاد کے محکمہ کے تحت ہوں کیونکہ یہ ایک دوسرے سے باہم مربوط ہیں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عمل کے مطابق، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا جائے۔

لہٰذا اِن محکمات کی فعالیت میں وسعت کی خاطر، خاص طور پر اِن ایام میں جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ عسکری اقسام میں اضافہ ہوتا جارہا ہے، داخلی مسائل، دیگر ریاستوں کے مختلف الانواع خفیہ سازشی حربوں، ان کے ایجنٹ، بکے ہوئے سیاست دانوں کے گروہ، نت نئے جرائم، بین الاقوامی تعلقات کی گتھیاں... اسی طرح صنعت کاری کی نئی اور متعدد اقسام، اور جدید تکنیکی وسائل کی پیچیدگیوں کے پیشِ نظر؛ اور اس لئے کہ امیر جہاد کے اختیارات حد سے تجاوز نہ کر جائیں اور وہ ریاست میں ایک اور قوت کا مرکز نہ بن جائے، جو امیر جہاد کے تقویٰ کے کم ہونے کی صورت میں ریاست کی کمزوری کا سبب بنے، اِن تمام وجوہات کی روشنی میں ہم یہ تبنی کرتے ہیں کہ یہ چاروں محکمے (ایک امیر کے تحت ہونے کی بجائے) علیحدہ علیحدہ ہوں گے، اور مندرجہ ذیل نہج پر مستقل شعبوں کی حیثیت سے خلیفہ ہی سے منسلک ہوں گے:

- امیر جہاد: شعبۂ جنگ (فوج)
- شعبۂ داخلی امن
- شعبۂ صنعت
- شعبۂ عالمی تعلقات

پانچواں:

امیر جہاد- شعبۂ حرب (فوج)

شعبۂ جنگ ریاست کے ڈھانچوں میں سے ایک ادارہ ہے جس کے امیر کو امیر جہاد کہا جاتا ہے، تاہم وہ جہاد کا منتظم نہیں ہوتا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ فوج کے قائدین کو امیر کا نام دیا کرتے تھے۔ طبقات ابنِ سعد میں مروی ہے:

((امیر النّاس زید بن حارثة، فإن قتل فجعفر بن ابی طالب، فإن قتل فعبد اللّٰه بن رواحة، فإن قتل فلیرتض المسلمون بینهم رجلاً فیجعلوه علیهم))

''(جنگِ موتہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) لوگوں کے امیر زید بن حارثہ ہوں گے، اگر وہ شہید ہو جائیں تو جعفر بن ابی طالب امیر ہوں گے اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ امیر ہوں گے اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان اپنی رضا سے اپنے اوپر کسی کو امیر بنالیں''

بخاری میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں: ''جنگِ مؤتہ میں رسول اللہ ﷺ نے زید رضی اللہ عنہ کو امیر مقرر فرمایا''۔ ایسی ہی روایت بخاری نے سلمہ ابن الاکوع رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں: ''میں زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ لڑائی میں شریک تھا اور اُنھیں امیر بنایا گیا تھا''۔ نیز بخاری اور مسلم نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

((بعث النبی ﷺ بعثاً، وَّ اَمَّرَ علیهم اسامة بن زیدٍ، فَطُعِنَ بعض الناس فی اِمارته، فقال النبی ﷺ : اِن تَطعُنُوا فی اِمارته فَقَد کنتم تَطعُنون فی اِمَارة اَبیه من قبل، وَ اَیمُ اللّٰهِ اِن کانَ لَخَلِیقًا للامارة...))

''رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر روانہ کیا اور اس کا امیر اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا تو اُن کی امارت پر اعتراض کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم اس کی امارت پر اعتراض کرتے ہو، اور تم اس سے پہلے اسامہ کے والد کی امارت پر بھی اعتراض کر چکے ہو، حالانکہ اللہ کی قسم! وہ امارت کیلئے موزوں تھے''

صحابۂ کرام مؤتہ کی فوج کو امراء کی فوج کہا کرتے تھے، مسلم نے بردہ سے روایت کیا ہے: ''جب آپ ﷺ کسی فوج یا لشکر پر امیر مقرر فرماتے تو اُسے ہدایات فرمایا کرتے تھے...''۔

مسلح افواج سے متعلق تمام امور شعبۂ حرب کے ذیل آتے ہیں؛ فوج، فوجی آلات، اسلحہ، فوجی تنصیبات، گولہ بارود وغیرہ، فوجی کالج، فوجی مشن، فوج کی اسلامی تربیت اور عام تربیتی ضروریات، نیز ہر وہ چیز جو جنگ اور جنگ کی تیاری سے متعلق ہو، یہ سب شعبۂ حرب کے ضمن میں آتا ہے۔ اسی طرح حربی کفار کی نگرانی و جاسوسی کیلئے مخصوص ادارہ قائم کرنا بھی اسی شعبے کی ذمہ داری ہوتی ہے اور اس کے دلائل سیرتِ نبوی ﷺ میں کثرت سے آتے ہیں۔

یہ تمام ذمہ داریاں شعبۂ حرب کے ضمن میں آتی ہیں اور یہی شعبہ اِن امور پر نگراں ہوتا ہے۔ اس شعبہ کا نام ہی جنگ اور قتال سے متعلق ہے، جنگ کیلئے فوج ضروری ہے اور فوج کیلئے تیاری، آلات، فوجی قیادت، افسران اور سپاہی ناگزیر ہوتے ہیں۔

فوج کیلئے جہاں جنگی آلات ضروری ہوتے ہیں وہاں فوج کی جسمانی اور تکنیکی تربیت جس میں مختلف نوع کا اسلحہ اور لڑائی کے فن کی تربیت شامل ہے، کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ لڑائی کا یہ فن نئے ہتھیاروں کے ایجاد ہونے سے ترقی کرتا جاتا ہے۔ لہٰذا تکنیکی اور عسکری تعلیم افواج کی لازمی ضرورت ہے، نیز لڑائی کے فن اور مختلف نوع کے اسلحے کی استعمال کی تربیت بھی ناگزیر ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ اُنھیں اسلام کے پیغام کو پوری دنیا تک پہنچانے کی ذمہ داری سونپی اور اس کے طریقہ کار کا بھی تعین کر دیا ہے کہ یہ پیغام دعوت اور

جہاد کے ذریعہ پہنچایا جائے گا۔ پھر جہاد کو مسلمانوں پر فرض قرار دیا اور افواج کی تربیت کو لازم ٹھہرایا۔

لہٰذا ہر مسلم مرد جس کی عمر پندرہ سال کو پہنچ جائے، اُس پر لازم ہے کہ وہ جہاد کی تیاری کیلئے فوجی تربیت حاصل کرے، البتہ فوج میں شمولیت فرضِ کفایہ ہے۔

اس فوجی تربیت کیلئے دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾

''اور تم اُن سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ ہی کا ہو جائے'' (انفال: 39)

اور اللہ کے رسول ﷺ کا یہ فرمان بھی دلیل ہے جسے ابوداؤد نے انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا:

((جاهدوا المشركين بأموالكم و أنفسكم و ألسنتكم))

''مشرکوں کے ساتھ جہاد کرو اپنی جانوں سے، اپنے مال سے اور اپنی زبان سے''

لہٰذا آج جب قتال کی نوبت آئے تو یہ ضروری ہے کہ قتال کیلئے صحیح مشق اور تربیت کی جائے تاکہ یہ شرعاً مطلوبہ نتائج برپا کرے یعنی دشمنوں میں خوف ڈال دے اور ممالک فتح ہوں۔ اس شرعی قاعدے کی رو سے کہ (مالا يتم الواجب إلا به فهو واجب) یعنی ''جس چیز کے بغیر کوئی فرض پورا نہ ہوتا ہو تو وہ چیز بھی فرض ہو جاتی ہے''، جہاد کیلئے مشق و تربیت بھی جہاد ہی کی طرح عملاً فرض ہو جاتی ہے کیونکہ یہ قتال کے مطالبہ کا ہی حصہ ہے اور گزشتہ آیت میں وارد لفظ قٰتِلُوْهُم عام ہے اور یہاں قتال کا حکم دیا جا رہا ہے اور جن چیزوں سے یہ حکم پورا ہوتا ہو وہ بھی اسی حکم میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾

''اور جس قدر بھی ہو سکے تم ان کیلئے طاقت تیار رکھو'' (انفال: 60)

مشق اور اعلیٰ فوجی مہارت اور تجربہ قوت کا حصہ ہیں کیونکہ قتال کو کما حقہ سرانجام دینے کیلئے یہ ضروری ہیں، جس طرح جنگی آلات اور جنگی مشن وغیرہ ضروری ہوتی ہیں۔

جہاں تک مستقل فوجی بھرتی کا تعلق ہے، تو اس کے معنی سپاہیوں کو مسلح کر کے اُنھیں مستقل طور پر فوج کا حصہ بنانا ہے یعنی انہیں جہاد اور اُس کی ضروریات کیلئے عملاً تیار رکھنا ہے، اور یہ فرض ہے کیونکہ جہاد ایک دائمی اور متواتر فریضہ ہے خواہ دشمن نے ہم پر حملہ کیا ہو یا نہیں۔ لہٰذا فوجی بھرتی جہاد ہی کے حکم میں شامل ہے۔

رہی بات اس کیلئے پندرہ سال کی عمر ہونا، تو بخاری میں نافع سے حدیث مروی ہے:

(حدثني ابن عمر رضی اللہ عنہ أن رسول الله ﷺ عرضه يوم أحد وهو ابن أربع عشرة سنة فلم يجزني، ثم عرضني يوم الخندق وأنا ابن خمس عشر سنة فأجازني)

''ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے بتایا کہ اُنھیں رسول اللہ ﷺ کے سامنے (جہاد میں شرکت کیلئے) پیش کیا گیا جب اُن کی عمر چودہ سال کی تھی، تو آپ ﷺ نے (شرکت کی) اجازت نہیں دی۔ پھر اُنھیں جنگِ خندق کے موقع پر پیش کیا گیا جب وہ پندرہ سال کے تھے تو آپ ﷺ نے اجازت دے دی''

اس روایت کے راوی نافع کہتے ہیں کہ جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو میں اُن کے پاس گیا اور اُنھیں یہ حدیث سنائی اور اُنھوں نے فرمایا: ''یہ عمر بڑے اور چھوٹے کے درمیان حدِّ فاصل ہے، پھر اُنھوں نے اپنے عمّال کو لکھا کہ وہ ہر پندرہ سال سے بڑے شخص کیلئے یہ فرض کر دیں''، یعنی فوجی بھرتی کے دفتر میں اُن کیلئے ملازمت طے کر دیں۔

لہٰذا ہم یہی تبنی کرتے ہیں کہ جس مسلمان مرد کی عمر پندرہ سال کو پہنچے اُس پر عسکری تربیت لازم ہوگی۔

فوج کی قسمیں:

فوج کی دو اقسام ہوتی ہیں: ایک احتیاطی فوج، جس میں ہر وہ شخص شامل ہوتا ہے جو جنگی عمل (military task) سرانجام دے سکتا ہو اور دوسری دائمی فوج، جس میں شامل لوگوں کی ریاست کے بجٹ میں ریاستی ملازمین کی طرح ہی تنخواہیں مختص کی جاتی ہیں۔

یہ امر جہاد کے فریضہ سے ہی ماخوذ ہے، چونکہ ہر مسلمان پر جہاد اور اُس کی مشق تربیت لازم ہے، اس لئے ہر مسلمان احتیاطی سپاہی ہوتا ہے۔ رہی بات ایک دائمی قسم کی فوج کی تو اس کی دلیل بھی یہی شرعی قاعدہ ہے جس کی رُو سے ہر وہ چیز جس کے بغیر کوئی فرض مکمل نہ ہوتا ہو، وہ چیز بھی فرض ہو جاتی ہے یعنی **(ما لا یتم الواجب إلّا بہٖ فھو واجب)**؛ چونکہ دائمی جہاد کے فریضے کی ادائیگی اور اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت ایک مستقل فوج کے بغیر ممکن نہیں، چنانچہ خلیفہ یا امام کیلئے یہ لازمی ہوگا کہ وہ ایک مستقل فوج قائم کرے۔

اب رہی اِن فوجیوں کیلئے تنخواہیں مخصوص کرنے کی بات، تو یہ تنخواہیں غیر مسلموں کیلئے ہونا تو ظاہر ہے کیونکہ جہاد کا اُن سے مطالبہ نہیں ہوتا لیکن اگر وہ خود سامنے آئیں تو اُن کی پیشکش کو قبول کرنا جائز ہے؛ جیسا کہ ترمذی میں زہری کی روایت ہے، اور انھیں اس کے عوض مال بھی دیا جاتا ہے:

(أنَّ النبیﷺ أسھم لقوم من الیھود قاتلوا معه)

''رسول اللہﷺ نے اُن یہودیوں کو مال دیا تھا جنھوں نے آپﷺ کے ساتھ مل کر قتال کیا''

اسی طرح ابنِ ہشام کی روایت ہے:

(أنَّ صفوان ابن أمیة خرج مع النبیﷺ إلی حنین، وھو علی شرکہٖ، فأعطاه مع المؤلفة قلوبھم من غنائم حنین)

''صفوان ابن امیہ جو اس وقت مشرک تھا، آپﷺ کے ساتھ جنگِ حُنین کیلئے نکلا، آپ ﷺ نے اُسے تألیف قلب کیلئے حنین کے مالِ غنیمت میں سے مال عطا کیا''

لہٰذا کافر کا اسلامی فوج میں شامل ہونا درست ہے اور اُس کے فوج میں ہونے کے سبب اُسے مال دیا جانا بھی درست ہے۔ اس کے علاوہ لفظ اجرت کی تعریف یہ ہے یہ کسی منفعت کے حصول کے بدلے اس کا عوض دینے کا عقد (contract) ہے، تو یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کیونکہ ایک شخص سے کسی بھی جائز منفعت حاصل کرنے کے بدلے اسے اجرت دینا صحیح ہے۔ اور ایک شخص کو فوج میں شامل ہونے کے عوض اجرت دینا اسی کے ضمن میں آتا ہے اور یہاں اس

شخص سے حاصل ہونے والی منفعت قتال ہے۔ اجرت کی اس دلیل کا کسی بھی قسم کی منفعت کے لیے عام ہونا کافر کو اسلامی فوج میں قتال کیلئے بھرتی کرنے اور اس کیلئے اسے اجرت دینے کو جائز بناتا ہے۔

یہ بحث تو غیر مسلم کے متعلق تھی، جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے کہ جن کے لیے جہاد ایک عبادت ہے، تو ایک مسلمان کو جہاد اور قتال کیلئے فوج میں اجرت پر رکھنا صحیح ہے، کیونکہ اجرت کی دلیل مخصوص نہیں بلکہ عمومی نوعیت کی ہے؛ اور عبادت کیلئے اجرت جائز ہے اگر اس کا نفع اس شخص کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی پہنچتا ہو، کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے:

((إنّ أحق ما أخذتم عليه أجراً كتاب اللّٰه))

''بے شک، جن چیزوں کے بدلے تم اجرت لیتے ہو، اس میں سب سے زیادہ اللہ کی کتاب لائقِ اجرت ہے'' (بخاری نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا)

جبکہ اللہ کی کتاب کی تعلیم دینا ایک عبادت ہے، تو جس طرح اللہ کی کتاب کی تعلیم، امامت، اذان جو کہ عبادات ہیں اِن کیلئے اجرت صحیح ہے، اسی طرح جہاد اور فوج میں شمولیت کیلئے اجرت بھی صحیح ہے، گو کہ یہ عبادت ہے، اور گو کہ عبادت کے کرنے والے کیلئے اجر اس کے علاوہ ہے۔ علاوہ ازیں مسلمان کو جہاد کیلئے اجرت دینے اور مسلمانوں کو فوج میں اجرت پر بھرتی کرنے کے جواز کے دلائل احادیث میں صریحاً وارد ہوئے ہیں، ابوداؤد نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((للغازي أجره، و للجاعل أجره و أجر الغازي))

''غازی کے لیے اپنا اجر ہے، اور جاعل کے لیے اپنا اجر بھی ہے اور غازی کا اجر بھی''

غازی وہ شخص ہے جو بذاتِ خود قتال کرے اور جاعل وہ ہے جس کی جگہ کوئی اور شخص جہاد کرے اور وہ اس شخص کو جہاد کی اُجرت دے۔ قاموس المحیط میں بیان کیا گیا: (والجعالة مثلثة ما جعله له على عمله و تجاعلوا الشيء جعلوه بينهم، و ما تجعل للغازي إذا غزا عنك بِجُعْل) "جعالة وہ اجرت

ہے جو کسی کو کوئی کام کرنے پر دی جاتی ہے، اور وہ اجرت جو مجاہد (غازی) کو دی جاتی ہے، جب وہ کسی اور کی جگہ اُجرت پر جہاد کرتا ہے"۔ چنانچہ اس حدیث کی رو سے واضح ہو گیا کہ کسی شخص کیلئے کسی اور شخص کو اجرت دے کر اپنے عوض جہاد پر بھیجنا صحیح ہے۔ بیہقی نے جبیر بن نفیر رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث روایت کی کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مثل الذين يغزون من امتي، و يا خذونَ الجُعل، و يتقوون على عدوهم، مثل ام موسى، ترضع ولدها، و تاخذ أجرها))

''میرے امت میں سے جو جہاد کرتے ہیں اور اجرت (بھی) لیتے ہیں، اور خود کو دشمن کے خلاف قوی بناتے ہیں، ان کی مثال موسیٰ کی والدہ کی طرح ہے جو اپنے ہی بیٹے کو دودھ بھی پلاتی تھیں اور اسکی اجرت بھی اُنہیں مل جاتی تھی''

اِن احادیث میں اجر سے مراد اجرت ہے، لہٰذا فوجیوں کیلئے ملازمین کی طرح تنخواہیں مخصوص ہونا صحیح ہے۔

مسلمان سپاہی گو کہ اجرت لیتا ہے لیکن اُس کا اجر اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، کیونکہ جیسا ابھی بخاری کی حدیث میں گزرا کہ اللہ کی کتاب کی تعلیم پر اجرت لینا صحیح ہے جبکہ یہ اللہ کی عبادت ہے، یعنی اُس کا اجر قرآن پڑھانے والے کی نیت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

اسلامی فوج ایک فوج ہوتی ہے جس کی متعدد حصے ہوتے ہیں جنہیں مختلف نمبر دیے جائیں گے جیسے کہ پہلا حصہ، دوسرا حصہ، تیسرا حصہ وغیرہ یا ان کے نام مختلف ولایات یا شہروں کے نام پر رکھے جائیں گے مثال کے طور پر شام کی فوج، مصر کی فوج، صنعاء کی فوج وغیرہ۔

اسلامی افواج کو مخصوص معسکرات میں رکھا جائے گا اور ہر معسکر میں فوجیوں کی کچھ تعداد رکھی جائے گی جن میں ایک دو یا متعدد اقسام کے سپاہی ہو سکتے ہیں۔ ایسے معسکرات کیلئے البتہ مناسب ہوگا کہ یہ مختلف ولایات میں پھیلے ہوئے ہوں اور اِن میں سے بعض معسکر فوجی اڈوں پر ہوں جبکہ بعض دیگر معسکر دائمی طور پر متحرک ہوں گے جو ہمیشہ حملے کیلئے مستعد رہیں۔ ہر معسکر

کیلئے مخصوص نام ہوگا جیسے معسکرِ حبانیہ وغیرہ اور ہر معسکر کا اپنا پرچم ہوگا۔

یہ ترتیب یا تو مباحات میں سے ہے جیسا کہ افواج کا نام ولایات (صوبوں) کے نام پر رکھنا یا انہیں مخصوص نمبر دینا چنانچہ یہ خلیفہ کی رائے اور اجتہاد پر موقوف ہے اور یا یہ ان معاملات میں سے ہیں جنہیں اختیار کرنا ریاست کی حفاظت اور افواج کو مضبوط بنانے کے لیے لازمی ہے، تو یہ اس قائدے کے تحت آتے ہیں: (**مالا یتم الواجب إلا بہ فھو واجب**) یعنی ''جس کے بغیر کوئی فریضہ پورا نہ ہوتا ہو، تو وہ چیز بھی فرض ہوجاتی ہے''، جیسا کہ افواج کے معسکرات کا **سٹریٹیجک** مقامات پر موجود ہونا۔

عمر رضی اللہ عنہ نے فوجی معسکرات کو تمام ولایات (صوبوں) کے نام پر تقسیم کیا تھا۔ آپؓ نے فلسطین کو ایک یونٹ بنایا اور موصل کو علیحدہ یونٹ بنایا۔ آپؓ فوج کے ایک حصے کو ریاست کے مرکز میں رکھا کرتے تھے اور فوج کے ایک حصے کو ہمہ وقت چوکس رکھتے تھے تاکہ وہ آنِ واحد میں فوری جنگ کے لیے تیار ہوجائے۔

خلیفہ ہی فوج کا قائد ہوتا ہے:

خلیفہ فوج کا قائد ہوتا ہے اور خلیفہ ہی فوج کے چیف آف سٹاف، ہر لواء (Brigade) کے امیر، نیز فوج کے ہر فِرَق (ڈویژن) کا کمانڈر مقرر کرتا ہے۔ البتہ فوج کے باقی مراتب (Ranks) کا تقرر ان کے قائدین یا لِواء کے امیر کرتے ہیں۔ چیف آف سٹاف کے تحت افسران کا تقرر اُن کی عسکری قابلیت کی بنیاد پر چیف آف سٹاف ہی کرتا ہے۔

خلیفہ ہی کے فوج کا قائد ہونے کا سبب یہ ہے کہ خلافت پوری دنیا کے مسلمانوں کی امارتِ عامہ ہے؛ جس کا مقصد اسلام کے احکام کو قائم و نافذ کرنا اور تمام عالم میں اسلام کے پیغام کو پہنچانا ہے جس کا بنیادی طریقہ جہاد ہے لہٰذا یہ ناگزیر ہے کہ خلیفہ ہی جہاد کا نگران ہو، کیونکہ خلافت کا عقد خلیفہ کے ساتھ ذاتی طور پر طے پاتا ہے، لہٰذا یہ جائز نہیں کہ یہ ذمہ داری کوئی اور انجام

دے، چنانچہ یہ ضروری ہوا کہ جہاد کے امور خلیفہ ہی کیلئے خاص ہوں نہ کہ کسی اور کیلئے، گو کہ تمام مسلمان ہی جہاد میں شامل ہوتے ہیں۔ جہاد میں شامل ہونا ایک بات ہے اور جہاد کے امور کی ذمہ داری اور نگرانی اس سے مختلف شئے ہے۔ جہاد ہر ایک مسلمان پر فرض ہے لیکن جہاد کے امور کی نگہداشت خلیفہ ہی کیلئے خاص ہے نہ کہ کسی اور کیلئے۔ البتہ اس فریضہ کی ادائیگی کیلئے خلیفہ اپنے لیے نائب مقرر کرسکتا ہے جو اُس کی نگرانی میں اس کام کو سرانجام دے، لیکن ایسی نیابت جائز نہیں جو مطلق اور خودمختار ہو اور خلیفہ کی اطلاع و نگرانی کے بغیر ہو۔ یہاں نائب کی طرف سے خلیفہ کو مطلع کرنے سے مراد وہ نہیں ہے جیسے معاون کرتا ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو نائب اس کام کیلئے مقرر کیا جائے وہ خلیفہ کی براہِ راست نگرانی اور ماتحتی میں جہاد کے مطلوبہ افعال انجام دے۔ پس فوج کی قیادت اس بات کی پابند ہوتی ہے کہ وہ خلیفہ ہی کی ماتحتی اور نگرانی میں رہے اور خلیفہ جسے چاہے اپنے نائب کے طور پر فوج کا قائد مقرر کرسکتا ہے۔ اور خلیفہ کی نگرانی اور ماتحتی کے بغیر یہ کام انجام دیا جانا جائز نہیں ہوتا اور نہ یہ جائز ہوتا ہے کہ یہ نگرانی اور ماتحتی محض برائے نام ہو کیونکہ خلافت کا عقد تو خلیفہ ہی کی ذات کے ساتھ طے پاتا ہے، لہٰذا جہاد کے امور کی دیکھ بھال اور نگرانی اُس پر لازم آتی ہے۔ لہٰذا جیسا غیر اسلامی نظاموں میں ہوتا ہے کہ جہاں ریاست کا سربراہ فوج کا قائدِ اعلیٰ تو ہوتا ہے، لیکن وہ محض برائے نام قائد اعلیٰ ہوتا ہے جبکہ فوج کا مستقل اور خودمختار قائد کوئی اور ہوتا ہے، تو یہ اسلام کی رُو سے باطل اور شریعت کے مخالف ہے، بلکہ شریعت یہ واجب قرار دیتی ہے کہ خلیفہ عملاً فوج کا قائد اعلیٰ ہو۔ البتہ جہاں تک فنی اور انتظامی معاملات کی سربراہی کا تعلق ہے تو اگر خلیفہ اس کے لیے کسی کو نائب کے طور پر مقرر کرتا ہے، تو اس کیلئے ایسی قید نہیں ہوتی کہ وہ خلیفہ کی براہِ راست نگرانی میں امور کو سرانجام دے۔

مزید یہ کہ رسول اللہ ﷺ بذاتِ خود فوج کے قائد رہے اور آپ ﷺ غزوات میں بھی فعلاً فوج کی قیادت فرماتے تھے، اور جن فوجی دستوں یا ٹکڑیوں کو آپ ﷺ قتال کیلئے بھیجتے تھے اُن پر آپ ﷺ خود امیر مقرر فرماتے تھے۔ اور بعض اوقات اس احتیاط کے زیرِ نظر کہ اگر ایک امیر کو قتل کر دیا جائے تو اُس کے بعد کیلئے آئندہ امیر یا قائد کا تعین بھی کر دیتے تھے، جیسا کہ جنگِ مؤتہ کے

موقع پر ہوا، چنانچہ بخاری نے عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے:

(أمَّرَ رسول اللّٰه ﷺ فی غزوة مؤتة زید ابن حارثة.فقال رسول اللّٰه ﷺ: إن قُتِلَ زید فجعفر، فإن قُتِلَ جعفر فعبداللّٰه بن رواحة)

''اللہ کے رسول ﷺ نے غزوہ مؤتہ کے وقت زید بن حارثہؓ کو قائد مقرر کیا اور فرمایا کہ اگر زید قتل ہو جائیں تو جعفر قائد ہوں گے اور اگر وہ بھی قتل کر دیئے جائیں تو عبداللہ بن رواحہ قائد ہوں گے''

لہٰذا خلیفہ ہی فوج کے قائد اور لواء یعنی بریگیڈز کے امیروں کا تقرر کرتا ہے اور اُنھیں لواء یعنی پرچم عطا کرتا ہے، نیز خلیفہ فِرَق (ڈویژن) کے قائدین کا بھی تقرر کرتا ہے۔ وہ فوجیں جو شام بھیجی گئی تھیں، مثلاً مؤتہ کی فوج یا اسامہؓ کی فوج، تو اُن کی نوعیت لواء یا Brigades کی طرح تھی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اُنھیں لواء (جھنڈا) عطا فرمایا تھا، نیز وہ سرایا یا رسالہ جو جزیرہٗ عرب کے مختلف حصوں میں لڑائی کیلئے جایا کرتے تھے، مثلاً سعد ابن ابی وقاصؓ کا رسالہ جو مکہ کی جانب بھیجا گیا تھا، اُن کی حیثیت Squadrons/Units کی مانند تھی؛ جو اس بات کیلئے دلیل ٹھہری کہ لواء کے قائدین اور رسالوں کے امراء کا تقرر خلیفہ ہی کی جانب سے ہوتا ہے۔ البتہ لواء کے قائد اور رسالوں کے امیر کے ماسوا افراد کا تقرر رسول اللہ ﷺ کی جانب سے کیا جانا ثابت نہیں؛ جو اس بات کیلئے دلیل ہوئی کہ غزوات کے دوران اِن کی تقرری اِن کے مقرر کردہ امیروں پر چھوڑ دی جاتی تھی۔ فوج کے قائد کی طرح چیف آف سٹاف کو خلیفہ ہی مقرر کرتا ہے، جو فنی امور کا نگران ہوتا ہے۔ یہ چیف آف سٹاف اپنے کام کو خلیفہ کی نگرانی میں انجام دیتا ہے البتہ اُس پر خلیفہ کی نگرانی براہِ راست نہیں ہوتی گو کہ وہ خلیفہ ہی کے ماتحت ہوتا ہے۔

چھٹا:

داخلی امن

ریاست کی داخلی سلامتی و امن کی ذمہ داری شعبہ اَمنِ داخلی پر ہوتی ہے جس کی سربراہی مدیرالامن الداخلی (Director of Internal Security) کرتا ہے۔ اس کی شاخ ریاست کی ہر ولایہ میں ہوگی جسے ادارۂ امن داخلی کہا جائے گا اور جس کی سربراہی اس ولایہ میں شرطہ کا افسر کرے گا، جو ذمہ داریوں کی انجام دہی میں والی کے تابع ہوگا لیکن انتظامی امور کے اعتبار سے شعبۂ امنِ داخلی کے ماتحت ہوگا۔ اور اس معاملے کو مخصوص قانون کے تحت منظّم کیا جائے گا۔

شعبۂ امنِ داخلی ہی وہ ادارہ ہوتا ہے جو امن وسلامتی سے متعلق تمام امور کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہ ادارہ شرطہ (پولیس فورس) کے ذریعہ ریاست بھر میں امن وسلامتی کی ذمہ داری سنبھالتا ہے اور امن وسلامتی کو برقرار رکھنے کیلئے یہ محکمہ مرکزی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اسے شرطہ کی خدمات ہمہ وقت حاصل رہتی ہیں اور یہ جس طرح چاہے اُن کی خدمات حاصل کرسکتا ہے۔ نیز اس محکمہ کا حکم فوراً نافذ ہوتا ہے۔ جب اس محکمہ کو فوجی معاونت کی ضرورت محسوس ہو تو اِس پر یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ خلیفہ سے اس کی درخواست کرے۔ اب یہ خلیفہ کی صوابدید پر ہوتا ہے کہ وہ فوج کو محکمہ امن داخلی کی معاونت کا حکم دے، یا فوجی سپاہی اس محکمہ کو مہیا کردے یا جس طرح خلیفہ مناسب سمجھے اقدام کرے۔ خلیفہ کو یہ بھی اختیار ہوتا ہے کہ وہ محکمہ کی اس درخواست کو مسترد کردے اور اُنھیں محض شرطہ پر ہی اکتفاء کرنے کا حکم دے۔

شرطہ (پولیس فورس) وہ بالغ العمر افراد ہوں گے جو ریاست کے شہری ہوں، اس میں عورتوں کیلئے گنجائش ہے جو محکمہ اَمن داخلی کی عورتوں سے متعلق کاروائیوں میں شریک ہوں۔ اس مقصد کیلئے احکامِ شریعت کے مطابق خصوصی قانون جاری کیا جائے گا۔

شرطہ کی دو اقسام ہوتی ہیں، ایک عسکری شرطہ اور دوسرا وہ جو حاکم کے جوار میں ہوتا ہے، استقرارِ امن کیلئے اِن کے مخصوص لباس اور خاص علامات ہوتی ہیں۔

الأزهری نے کہا: (شرطة كل شيء خياره و منه الشُرطِ لأنهم نُخبة و قيل هم أول طائفة تتقدم الجيش و قيل سُموا شُرَطًا لأن لهم علامات يعرفون بها في اللباس و الهيئة) ''شرطة کسی چیز کا بہترین حصہ ہوتا ہے اور شُرَط اسی میں سے ہے کیونکہ یہ ممتاز ہوتے ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا دستہ ہوتے ہیں جو فوج کے آگے ہوتا ہے اور انہیں شُرَطًا اس وجہ سے کہا جاتا ہے کیونکہ ان کا امتیازی نشان اور خاص لباس ہوتا ہے''۔ یہی معانی ومطالب اصمعی نے اختیار کیے ہیں۔ قاموس میں آتا ہے: ''شرطہ کے شین پر پیش ہے اور اس کا صیغۂ واحد شُرَ ط ہے... یہ پہلا کتیبہ یا Regiment ہوتا ہے جو جنگ میں اترتا ہے اور موت کیلئے تیار رہتا ہے۔ یہ وہ دستہ ہوتا ہے جو والیوں کا معاون ہوتا ہے۔ اِن کے نام مثلاً ترکی شرطہ یا جہنی شرطہ وغیرہ ہوتے ہیں اور ان کے یہ نام شناخت کے مقصد کے لیے ہیں''۔

عسکری شرطہ افواج ہی کا جزو ہوتی ہے جس کی علیحدہ شناخت ہوتی ہے اور یہ فوج کے آگے رہتی ہے۔ عسکری شرطہ فوج اور امیر جہاد کے یعنی شعبۂ حرب کے تابع ہوتی ہے۔ شرطہ کی دوسری قسم جو حاکم کے جوار میں ہوتی ہے، وہ شعبہ اَمنِ داخلی کے ذیل میں آتی ہے۔ بخاری نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

((أن قيس ابن سعد رضی اللہ عنہ كان يكون بين يَدَي النبي ﷺ بمنزلة صاحب الشُرَطِ من الأمير))

''قیس بن سعد رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس طرح رہتے تھے جیسے ایک امیر کے ساتھ رئیسِ

شرطہ ہوتا ہے‘‘

یہاں قیس سے مراد قیس بن سعد بن عبادہ الخزرجی الانصاری ہیں۔ اسی طرح ترمذی میں روایت ہے کہ:

((كان قيس بن سعد من النبیﷺ بمنزلة صاحب الشرطةمن الأميرِ. قال الأنصاری:يعنى مما يلي من اموره))

’’قیس بن سعد رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس طرح رہتے تھے جیسے ایک امیر کے ساتھ رئیسِ شرطہ ہوتا ہے۔ الانصاری نے بیان کیا: یعنی وہ ان کے امور کو سرانجام دیا کرتے تھے‘‘

خلیفہ کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ یا تو اس شرطہ کو جو داخلی امن وسلامتی کو برقرار رکھتا ہے، افواج ہی کا حصہ بنائے یعنی شعبۂ حرب کے ذیل میں رکھے یا پھر اُس کیلئے علیحدہ اور مستقل محکمہ یعنی محکمۂ امن داخلی قائم کرے۔

ہم یہ تبنی کرتے ہیں کہ شرطہ کی اس قسم کو جو داخلی امن کی برقراری کیلئے حکمران کے جوار میں رہتی ہے، اسے علیحدہ حیثیت سے ہی رکھا جائے اور یہ شعبہ اُمنِ داخلی کے ذیل میں رہے جو ایک باقاعدہ محکمہ ہو اور خلیفہ دیگر ریاستی محکموں کی طرح اس پر نگران ہو۔ یہ قیس بن سعد رضی اللہ عنہ والی سابقہ حدیث کی بناء پر ہے اور جیسا کہ ہم نے جہاد سے متعلق اِن چار محکموں کے علیحدہ علیحدہ ہونے کی بحث میں بیان کیا ہے، اور خلیفہ ان چاروں شعبوں کی براہِ راست نگرانی کرے گا، اور یہ تمام ایک ہی شعبہ کی شکل میں نہیں ہوں گے۔

شعبۂ داخلی امن کی ذمہ داریاں:

شعبۂ داخلی امن کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ریاست کے اندر امن وسلامتی کو قائم رکھے۔ جن چیزوں سے داخلی امن وسلامتی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں:

اسلام سے ارتداد اور ریاست سے بغاوت یا خروج جس کا اظہار تخریب کاری اور

سبوتاژ کی شکل میں ہو مثلاً عمارتوں کو مسمار کرنا، ہڑتالیں، توڑ پھوڑ، انتشار، ریاست کے اہم مراکز پر قبضہ کر لینا اور وہاں لوگوں کو ہرغمال بنا لینا، ذاتی، عوامی اور ریاستی ملکیتوں کے خلاف جارحیت، یا مسلح لڑائی کے ذریعے ریاست کے خلاف بغاوت وغیرہ۔

اسی طرح حرابہ یعنی راہ زنی، لوگوں کو اُن کا مال لوٹ لینے کیلئے ڈرانا دھمکانا اور لوگوں کو پریشان کرنا بھی داخلی امن وسلامتی کیلئے خطرے کا باعث ہوتے ہیں۔

لوگوں کے اموال کی چوری، لوٹ مار، ڈکیتی، دھوکہ دہی، لوگوں کی املاک پر قبضہ، جان پر حملہ یعنی لوگوں کو مارنا پیٹنا یا انہیں زخمی کرنا یا قتل کرنا، لوگوں کی آبرو پر حملہ کرنا جیسا کہ اُن پر تہمت لگانا، اُن کے بارے میں غلط باتیں مشہور کرنا اور زنا بھی ان امور میں شامل ہیں جو داخلی امن و سلامتی کے لیے خطرہ ہوتے ہیں۔

نیز شعبہ اَمن داخلی کی ذمہ داریوں میں یہ بھی شامل ہوتا ہے کہ وہ مشکوک لوگوں سے نمٹے اور اُن سے امت اور ریاست کو لاحق خطرات کا ازالہ کرے۔

یہ وہ چیدہ چیدہ افعال ہیں جو ریاست کے داخلی امن کیلئے خطرے کا باعث ہوتے ہیں اور شعبہ اَمن داخلی اِن سے عوام اور ریاست کی حفاظت کا کام انجام دیتا ہے۔ لہٰذا جب ایک شخص ارتداد کا مرتکب ہوتا ہے اور پھر توبہ کر کے رجوع نہیں کرتا اور اُس پر قتل کا حکم صادر کیا جاتا ہے تو یہی شعبہ اُس کے قتل کے حکم کو نافذ کرتا ہے؛ پھر اگر ارتداد کرنے والوں کا پورا گروہ ہو تو اُن کا انسداد کیا جانا لازمی ہو جاتا ہے اور اُن سے اسلام کی جانب رجوع کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے، اگر وہ توبہ کر کے رجوع کر لیتے ہیں اور احکامِ شرع کے پابند ہو جاتے ہیں تو اُن سے درگزر کا معاملہ کیا جاتا ہے، لیکن اگر وہ ارتداد پر قائم رہیں تو پھر اُن سے قتال کیا جاتا ہے، اگر یہ گروہ تعداد میں اتنا ہی ہے کہ شرطہ ہی اُن سے مقابلہ کر کے اُنھیں زیر کر سکتا ہے تو اُن سے لڑا جاتا ہے اور اگر یہ گروہ بڑی تعداد میں ہے اور شرطہ کیلئے یہ ممکن نہیں کہ وہ از خود نمٹ سکے، تو اُس کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ خلیفہ سے عسکری امداد کی درخواست کرے اور اگر یہ بھی کافی نہ ہو تو براہِ راست عسکری مداخلت کی

درخواست کرے۔

یہ معاملہ تو مرتدین کا تھا، جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو ریاست سے بغاوت کریں، اور یہ بغاوت مسلح نہ ہو اور توڑ پھوڑ، تخریب کاری، ہڑتالوں، مظاہروں، اہم مراکز پر قبضہ، عوامی، ریاستی اور نجی املاک پر حملوں اور اُنھیں نقصان پہنچانے تک محدود ہو، تو شعبۂ امنِ داخلی محض شرطہ کے ذریعہ اِن اعمال کی روک تھام کرتا ہے۔ اگر شعبۂ امن داخلی محض شرطہ کے ذریعہ اِن اعمال کی روک تھام نہ کر پائے تو وہ باغیوں کے اِن اعمال کو روکنے کے لیے خلیفہ سے فوجی امداد کا مطالبہ کرتا ہے۔

اس کے برعکس اگر ریاست کے باغی ہتھیار اُٹھالیں اور کسی مقام پر قابض ہو کر اُس پر تسلط حاصل کرلیں، اور وہ ایک قوت بن جائیں اور شعبۂ امن داخلی کیلئے یہ ممکن نہ ہو کہ وہ ان سے رجوع کرائے اور ان پر بغاوت کی سزا کو نافذ کرے، تو ایسی صورت میں وہ خلیفہ سے حسبِ ضرورت فوجی امداد یا فوج طلب کرتا ہے جو اِن باغیوں کیلئے کافی ہو۔ پھر قبل اس کے کہ باغیوں سے قتال کی شروعات ہو، اُن سے گفتگو کی جاتی ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ ان کی کیا شکایات ہیں۔ پھر اُن سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اطاعت اور جماعت میں شمولیت کیلئے رجوع کرلیں اور اپنے ہتھیار ڈال دیں۔ اب اگر وہ مان جاتے ہیں اور رجوع کر لیتے ہیں اور پھر سے احکام شرع کے پابند ہو جاتے ہیں تو اُن کا معاملہ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ رجوع کرنے سے انکار کر دیں اور بغاوت وقتال پر قائم رہیں، تو اُن سے تادیبی قتال کیا جاتا ہے نہ کہ انہیں نیست و نابود کیا جائے اور صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔ تاکہ وہ ہتھیار ڈال کر بغاوت سے باز آجائیں اور اطاعت قبول کرلیں۔ جیسا کہ امام علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے ساتھ کیا تھا؛ کہ وہ پہلے اُنھیں اپنی طرف بلاتے تھے تاکہ وہ بغاوت سے باز آجائیں۔ پھر بھی جب وہ بغاوت پر جمے رہے تو اُن سے تادیبی قتال کیا تاکہ وہ ہتھیار ڈال کر اور بغاوت ترک کر کے اطاعت پر لوٹ آئیں۔

جہاں تک حرابہ کرنے والوں کا تعلق ہے جو راہزنی کریں، لوگوں پر حملے

کریں، شاہراہوں کو زبردستی بند کر کے لوگوں کو لوٹیں اور لوگوں کا قتل کریں تو شعبۂ امن داخلی اُن کی طرف پولیس فورس روانہ کرے گی تا کہ ان کا تعاقب کیا جائے اور اُن پر سزا نافذ کی جائے، جو کہ قتل کرنے، یا مخالف اطراف کا ہاتھ اور پیر کاٹنے یا علاقہ بدر کرنے کی ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں آیا ہے:

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ﴾

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑتے ہیں، اور زمین میں بگاڑ پیدا کرنے کیلئے تگ و دو کرتے ہیں، ان کا صلہ بس یہی ہے کہ قتل کئے جائیں، یا سولی پر چڑھائے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور پیر مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا انہیں علاقے سے نکال دیا جائے'' (المائدہ:33)

ایسے لوگوں سے قتال اُن لوگوں سے قتال سے مختلف ہے جو ریاست سے بغاوت کریں اور ہتھیار اُٹھائیں۔ اُن باغیوں سے قتال اُنہیں اطاعت میں لانے کی غرض سے کیا جاتا ہے جبکہ اِس قسم کے ڈکیتوں سے قتال اُنہیں قتل کرنے اور اُن کے ہاتھ پیر کاٹ دینے کیلئے ہوتا ہے۔ یہ لوگ خواہ مقابلہ کریں یا بھاگ کھڑے ہوں، اُن سے لڑا جاتا ہے جیسا کہ آیت میں وارد ہوا۔ اِن میں سے جو قتل اور مال لوٹنے کا مرتکب ہو، وہ قتل بھی کیا جائیگا اور لٹکایا بھی جائیگا؛ جو قتل کرے لیکن مال لوٹنے کا مرتکب نہ ہو، تو وہ قتل کیا جائیگا لیکن اُس کے ہاتھ پیر نہیں کاٹے جائیں گے؛ جو مال لوٹے لیکن قتل کرنے کا مرتکب نہ ہو، اس کا، یا تو داہنا ہاتھ اور باہنا پیر، یا پھر باہنا ہاتھ اور داہنا پیر کاٹ دیا جائیگا اور وہ قتل نہیں کیا جائیگا؛ اور جو ہتھیار اُٹھائے اور لوگوں کو ڈرائے دھمکائے، لیکن قتل اور مال لوٹنے کا مرتکب نہ ہو، تو وہ نہ قتل کیا جائیگا، نہ لٹکایا جائیگا اور نہ ہی اُس کے ہاتھ پیر کاٹے جائیں گے بلکہ اُسے اُس شہر کی بجائے ریاست کے دور دراز شہر میں رہنے پر مجبور کیا جائیگا یعنی شہر بدر کر دیا جائیگا۔

شعبۂ امنِ داخلی ریاست میں امن قائم رکھنے کیلئے صرف پولیس پر اکتفاء کرتا ہے، اور جب پولیس امن برقرار رکھنے سے قاصر ہو تب ہی شعبۂ امن داخلی خلیفہ سے حسبِ ضرورت

عسکری فورس یا فوجی مدد طلب کرتا ہے۔

جہاں تک لوگوں کے اموال پر حملے کا معاملہ ہے جیسے چوری، لوٹ اور لوگوں کی جان پر حملہ مثلاً کسی کو مارنا پیٹنا، زخمی یا قتل کر دینا، یا عزت پر حملہ جیسے لوگوں کے خلاف جھوٹی باتیں اُڑانا، جھوٹا الزام لگانا یا زنا کرنا، تو شعبۂ امنِ داخلی ایسے واقعات و حادثات کو نگرانی اور گشت سے روکتا ہے، اور اِن جرائم کے مرتکب لوگوں کے خلاف عدالتی احکامات کا نفاذ کرتا ہے۔ اِن سب کیلئے شعبہ اَمنِ داخلی صرف پولیس پر ہی اکتفاء کرتا ہے۔

نظام کی حفاظت اور داخلی امن وسلامتی پر نگرانی کیلئے شرطہ پر ہی انحصار کیا جاتا ہے، اسی طرح تمام امور کی تنفیذ بھی شرطہ ہی کے توسط سے کی جاتی ہے کیونکہ انس المار ﷺ کی روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قیس بن سعد ﷺ کو اپنے آگے صاحبِ شرطہ (ہیڈ آف پولیس) مقرر کر رکھا تھا، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ شرطہ (پولیس) حکام کے قریب ہو۔ یہاں اُن کے قریب یا سامنے ہونے سے مراد یہ ہے کہ حکمران کو جب بھی کسی شرعی حکم کی تنفیذ، نظام کی حفاظت یا امن و سلامتی کی حفاظت کے لیے قوتِ نافذہ کی ضرورت ہو تو شرطہ اُسے بجالائے۔ اسی طرح شرطہ کا کام ہے کہ وہ راتوں کو گشت کرے، چوروں کا پیچھا کرے، فساد پھیلانے والوں کو پکڑے اور جن لوگوں کو ایسے عناصر کا خوف ہو، انھیں اِن کے شر سے محفوظ رکھے۔ ابو بکر ﷺ کے عہدِ خلافت میں عبداللہ بن مسعود ﷺ راتوں کو گشت کرنے پر مامور کیے گئے تھے۔ عمر ﷺ اپنے عہدِ خلافت میں اپنے غلام کے ہمراہ بذاتِ خود یہ کام سرانجام دیا کرتے تھے اور بعض اوقات آپ کے ساتھ عبدالرحمٰن بن عوف ﷺ ہوا کرتے تھے۔ لہٰذا بعض مسلم ممالک میں موجود یہ طرزِ عمل کہ دکانداروں کو رات کے وقت اپنی دکانوں کی حفاظت کے لیے خود چوکیدار مقرر کرنا ہوتا ہے یا حکومت اُن کی دکانوں کی حفاظت کیلئے پہرے دار مقرر کرتی ہے اور ان لوگوں سے اس کے عوض رقم وصول کرتی ہے، یہ قطعاً غلط ہے؛ کیونکہ ایسی محافظت بہرحال حکومت ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہ محافظت اور نگرانی شرطہ کی مخصوص ڈیوٹیوں میں سے ہے، جس کے عوام ذمہ دار نہیں اور نہ اُن سے ایسی محافظت کی قیمت وصول کی جاسکتی ہیں۔

وہ لوگ جو افواہیں پھیلاتے ہوں اور لوگوں میں شکوک و وسوسے پیدا کرتے ہوں جن سے ریاست، معاشرے یا افراد کو خطرے اور نقصان کا اندیشہ ہو، ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے افراد سے نمٹے، اور عوام میں جس کسی کو ایسے افراد کی خبر ہو اُس کیلئے ضروری ہے کہ وہ اس خبر کی اطلاع متعلقہ ادارے تک پہنچائے۔ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو زید بن ارقم ﷺ سے بخاری و مسلم نے روایت کی ہے:

(كنت في غزاة، فسمعت عبدالله بن ابي يقول: لا تنفقوا على من عند رسول الله حتى ينفضوا من حوله، ولئن رجعنا الى المدينة ليخرجن الأعز منها الأذل، فذكرت ذلك لعمي أو لعمر، فذكره للنبي ﷺ فدعاني فحدثته .....الحديث)

وفي روايته مسلم فأتيت النبي ﷺ فأخبرته بذلك.

''زید ابن ارقم ﷺ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک غزوہ میں شریک تھا تو میں نے عبداللہ بن ابی کو کہتے سنا کہ جو لوگ اللہ کے رسول کے ساتھ ہیں اُن پر خرچ نہ کرو تا کہ وہ لوگ اللہ کے رسول کا ساتھ چھوڑ دیں، اور جب ہم مدینہ پہنچیں گے تو اُن میں سے معزز ذلیل کو نکال باہر کرے گا۔ میں نے یہ اطلاع اپنے چچا یا عمر ﷺ کو دی اور انہوں نے اس کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے مجھے بلا بھیجا اور میں نے اُنھیں ساری بات بتائی...، اور مسلم کی روایت میں ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اُنھیں ساری بات بتائی''

عبداللہ بن ابی کے حربی کفار کے ساتھ تعلقات معلوم تھے نیز وہ مدینہ کے اطراف بسے یہودیوں اور دیگر اسلام دشمن عناصر سے بھی میل جول رکھتا تھا۔ یہاں ہم اس موضوع کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں تا کہ اسے عوام کی جاسوسی سے خلط ملط نہ کیا جائے، جو کہ حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا﴾ ''اور جاسوسی نہ کرو'' (الحجرات: 12)۔ لہٰذا ایسی کاروائی صرف اُن ہی لوگوں کے خلاف ہوتی ہے جو اہلِ ریب (مشکوک) ہوں۔

یہ مشکوک وہ لوگ ہیں جو ان کفار کے ساتھ ملتے جلتے ہوں جو مسلمانوں کے ساتھ عملاً حالتِ جنگ میں ہوں (کافر حربی فعلاً) یا مسلمانوں کے خلاف دشمنانہ منصوبے رکھتے ہوں (کافر

حربی حکماً)۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حربی کفار کی جاسوسی جنگی پالیسی کا حصہ ہونے کے اعتبار سے اور مسلمانوں کو نقصان سے محفوظ رکھنے کے پیشِ نظر جائز ہے اور اس کیلئے شرعی دلائل وارد ہوئے ہیں، جو ہر طرح کے حربی کفار سے متعلق ہیں۔ ریاست پر ایسے لوگوں کی جاسوسی کا واجب ہونا تو واضح ہے، جن سے جنگ ہو رہی ہو، لیکن اُن کے ساتھ ساتھ وہ گروہ بھی اس میں شامل ہیں جو کافر حربی حکماً ہیں کیونکہ اُن سے ہمیشہ جنگ کا امکان ہوتا ہے۔

پس رعایا کا ہر وہ فرد جو حربی کفار سے میل جول رکھے، اس پر بھی شبہہ ہے کیونکہ اُس کا رابطہ ایسے لوگوں سے ہے جن کی جاسوسی حلال ہے، یعنی حربی کفار۔ اس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

1) جنگ کرنے والے کفار کی عملاً جاسوسی ریاست پر فرض ہے اور اس کی تاکید مندرجہ بالا دلائل کے علاوہ اس قائدے کی بناء پر بھی ہے: (**ما لا یتم الواجب الا به فهو واجب**) ''جس چیز کے بغیر ایک واجب پورا نہ ہو تو وہ چیز بھی واجب ہو جاتی ہے''، کیونکہ دشمن کی قوت، اُس کے مقاصد، منصوبہ عملی اور اُس کے عسکری اہمیت کے ٹھکانوں وغیرہ کی معلومات ایسا امر ہے جو اُسے شکست دینے میں نہایت اہم ہوتی ہے اور یہ تمام شعبۂ حرب کے تحت آتا ہے۔ اس ضمن میں عوام کے وہ لوگ بھی آ جاتے ہیں جو جنگ کرنے والے کافروں سے عملاً رابطہ رکھتے ہوں، کیونکہ بنیادی طور پر یہ صحیح نہیں کہ ریاستی شہری کسی ایسے دشمن سے رابطہ رکھتے ہوں جو مسلمانوں کے ساتھ حالتِ جنگ میں ہو، بلکہ ایسے دشمن کے ساتھ صرف جنگ کا تعلق ہونا چاہئے۔

2) کافر حربی حکماً (ایسے لوگ جو براہِ راست متحارب نہیں لیکن متحارب کے حکم میں آتے ہیں) کی جاسوسی جائز ہے اور یہ جاسوسی ان کی طرف سے ضرر کے وقت فرض ہو جاتی ہے، جیسا کہ یہ خطرہ ہو کہ وہ ان کفار کے ساتھ مل جائیں گے جو مسلمانوں کے ساتھ عملی طور پر حالتِ جنگ میں ہیں یا ان کی مدد کریں گے۔ ان کی دو اقسام ہیں:

پہلی قسم اُن حکمی متحاربین کی ہے جو اپنے ہی وطن میں مقیم ہوں، اِن کی جاسوسی شعبۂ

حرب کرتا ہے۔

دوسری قسم اُن حکمی متحاربین کی ہے جو ہماری ریاست میں داخل ہوں، جیسا کہ سفیر یا پناہ لے کر داخل ہونے والے (مستامین)؛ اِن کی نگرانی اور جاسوسی شعبۂ امنِ داخلی کے تحت آتی ہے۔

شعبہ امنِ داخلی ریاستِ خلافت کے ان باشندوں کی نگرانی اور جاسوسی کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے جو ریاست میں ان حکمی متحاربین کے عہدیداروں یا ان کے نمائندوں کے پاس بار بار جائیں۔ جبکہ شعبۂ حرب ان ریاستی باشندوں کی جاسوسی کرنے پر بھی ذمہ دار ہوتا ہے جو ان کفار کے عہدیداروں یا ان کے نمائندوں سے ان کے ملک میں ملتے ہیں۔ تاہم یہ جاسوسی دو اہم امور سے مشروط ہوتی ہے:

اول: شعبۂ حرب اور شعبہ امنِ داخلی کی طرف سے حکمی محاربین کے عہدیداروں اور نگرانی کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئے کہ ان سے ریاست کے کسی باشندے کی ملاقاتیں غیر معمولی اور توجہ طلب ہیں، خواہ یہ ملاقاتیں ریاست کے اندر ہوں یا باہر۔

دوم: اِن دونوں محکموں کی کاروائی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی معلومات کو قاضیٔ حسبہ کے روبرو پیش کیا جائے جو یہ فیصلہ کرے گا کہ آیا ان بار بار کی ملاقاتوں سے اسلام اور مسلمانوں کو خطرہ متوقع تھا یا نہیں۔

اور اگر معاملہ یہی ہو تو پھر شعبۂ امنِ داخلی کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ ایسے ریاستی شہریوں کی جاسوسی کرے جو ریاستِ خلافت میں ان حکمی متحاربین کے عہدیداروں یا ان کے نمائندوں کے پاس بار بار جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ شعبۂ حرب ان ریاستی شہریوں کی جاسوسی کرے جو حکمی متحاربین کے عہدیداروں یا ان کے نمائندوں سے ان کے ممالک میں بار بار ملاقات کرے۔ اس سب کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

1) اللہ تعالیٰ کے اس قول کے پیشِ نظر مسلمانوں کی جاسوسی حرام ہے: ﴿**وَلَا تَجَسَّسُوا**﴾ "اور

تجسس نہ کرو‘‘۔ اس میں جاسوسی کرنے کی عام ممانعت ہے، اور اس کا عموم برقرار رہے گا جب تک کہ کوئی ایسی دلیل نہ ہو جو اس حکم کی تخصیص کرتی ہو۔ اس کی تاکید احمد اور ابوداؤد کی اس حدیث سے ہوتی ہے جسے انہوں نے مقداد ﷺ اور ابو امامہ ﷺ کی سند سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إنَّ الأمير إذ ابتغى الريبة من النّاس أفسدهم))

’’جب امیر (خلیفہ) لوگوں میں شبہات کو تلاش کرے تو وہ لوگوں میں فساد (خرابی پیدا) کرے گا‘‘

لہٰذا مسلمان کی جاسوسی حرام ہے۔ اور اس کا اطلاق ریاست کے ذمی شہریوں پر بھی ہوتا ہے۔ پس مسلم اور غیر مسلم رعایا دونوں کی جاسوسی کرنا حرام ہے۔

2) اُن کافروں کی جاسوسی کرنا جو ہمارے ساتھ عملاً حالتِ جنگ میں ہیں یا اُن حکمی متحارب کفار کی جاسوسی کرنا جو اسلامی ریاست میں معاہدین اور مستامن ہیں جیسا کہ سفیر، یا اُن حکمی متحارب کفار کی ان ہی کے ملک میں جاسوسی کرنا، جائز ہے اور اگر اُن سے کسی خطرے کا امکان ہو تو ایسی صورت میں ریاست پر اُن کی جاسوسی فرض ہو جاتی ہے۔

سیرتِ نبوی میں اس کے دلائل واضح ہیں، مثلاً:

۞ سیرتِ ابن ہشام میں عبداللہ بن جحش ﷺ کی جنگی مہم کے بارے میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اُنھیں روانہ کرتے وقت ایک خط سونپا اور حکم دیا کہ اس خط کو دو دن کی مسافت طے کر لینے کے بعد ہی کھولنا۔ چنانچہ جب عبداللہ بن جحش ﷺ دو دن کی مسافت طے کر چکے تو اُس خط کو کھولا، اُس میں لکھا تھا:

((إذا نظرت في كتابي هذا، فأمض حتى تنزل نخلة بين مكة و الطائف، فترصدَّ بها قريشاً، و تعلم لنا من أخبارهم))

’’جب تم میرے اس خط کو دیکھو تو مکہ اور طائف کے درمیان نخلستان تک پہنچو اور وہاں سے قریش پر نظر رکھو اور اُن کی خبریں ہم تک پہنچاؤ‘‘

۞ غزوۂ بدر کے بارے میں سیرتِ ابن ہشام میں بیان کیا گیا ہے کہ ابنِ اسحٰق نے بیان کیا:

''رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ سوار ہو کر نکلے اور چلتے رہے یہاں تک کہ ایک عرب شیخ سے سامنا ہوا، رسول اللہ ﷺ نے شیخ سے قریش اور محمد اور اُن کے صحابہ کے بارے میں دریافت کیا اور اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا، شیخ نے کہا کہ میں اُس وقت تک آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا جب تک آپ لوگ اپنے بارے میں نہ بتا دیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم کچھ بتاؤ گے تب ہی ہم اپنے بارے میں بتائیں گے۔ شیخ نے کہا کہ تو کیا ادلے کا بدلہ ہوگا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ہاں''؛ تب شیخ نے کہا: ''... مجھے خبر ملی ہے کہ قریش فلاں فلاں دن مکہ سے روانہ ہوئے ہیں، اگر میری خبر صحیح ہے تو قریش آج فلاں جگہ ہو سکتے ہیں''۔ جب وہ شیخ اپنی خبر دے چکا تو پوچھا کہ آپ لوگ کون ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ہم پانی سے آئے ہیں'' اور وہاں سے چل دیے، شیخ پوچھ رہا تھا، کون سے پانی سے؟ کیا عراق کے پانی سے؟ (رسول اللہ نے جواب نہیں دیا) اور اپنے صحابہ کے پاس واپس تشریف لے آئے، پھر جب شام ہوئی تو آپ ﷺ نے علی، زبیر بن العوام، سعد بن ابی وقاص اور دیگر صحابہ کرام کو میدانِ بدر میں پانی والی جگہ کی طرف بھیجا اور قریش کے جاسوسوں کے متعلق معلومات اکٹھی کرنے کے لیے کہا''۔

۞ اسی طرح ابن ہشام نے ابن اسحٰق کی روایت نقل کی ہے، جس کی سرخی (title) ہے ''بسبس بن عمرو اور عدی بن ابی زغباء کی جاسوسیاں''۔ ابنِ اسحٰق نے بیان کیا: ''بسبس بن عمرو اور عدي بن ابی زغباء نے اُن بوڑھیوں کی گفتگو سنی جو وہ پانی بھرتے ہوئے قریش کے آنے والے قافلے کے متعلق کر رہی تھیں، پھر وہ اپنے اونٹ پر بیٹھ کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور انھیں ساری بات بتائی۔

گو کہ یہ دلائل قریش کیلئے ہیں جو کہ عملاً متحارب تھے، تاہم یہ حکمی متحاربین پر بھی منطبق ہوتے ہیں کیونکہ اُن سے جنگ متوقع امر ہوتی ہے۔ ان کے درمیان فرق صرف یہ ہے کہ عملی متحارب کفار کے خلاف جاسوسی کا عمل فرض ہوتا ہے کیونکہ جنگی حکمتِ عملی کے مطابق دشمن کو

شکست دینے کیلئے ایسا کرنا ناگزیر ہے؛ جبکہ حکمی متحاربوں کے ضمن میں یہ فرض نہیں بلکہ جائز ہوتا ہے کیونکہ اُن سے جنگ کا امکان ہوتا ہے۔ البتہ اِن حکمی متحاربین سے اگر ضرر کا خدشہ ہو، یعنی وہ عملی متحارب کفار کو مدد فراہم کریں یا عملی طور پر ان سے جاملیں، تو پھر اب اُن کی جاسوسی محض جائز نہیں رہتی بلکہ فرض ہو جاتی ہے۔

لہٰذا جنگ کرنے والے کفار کی جاسوسی مسلمانوں کیلئے جائز ہے اور ریاست پر اُس کا بندوبست کرنا واجب ہوتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت دلائل سے واضح ہوا اور مزید یہ کہ شرعی قاعدہ (**ما لا یتم الواجب إلا به فهو واجب**) کا تقاضا بھی یہی ہے۔

چنانچہ اگر ریاست کے عوام، خواہ وہ مسلم ہوں یا ذمی، اگر کفار سے بار بار ملاقاتیں کریں، خواہ یہ کفار وہ ہوں جن سے عملاً جنگ ہو رہی ہو یا وہ حکماً متحارب ہوں؛ اور ایسے لوگ اسلامی ریاست میں ہوں یا ریاست کے باہر اپنے ملک میں؛ تو ایسے مشکوک افراد کی جاسوسی اور نگرانی جائز ہوگی، کیونکہ اُن کے رابطے اُن لوگوں سے ہیں جن کی جاسوسی جائز ہے اور اس لئے بھی کہ اُن کا کفار کیلئے جاسوسی کرنا ریاست کیلئے ضرر کا باعث ہوتا ہے۔

البتہ اس قسم کی جاسوسی کیلئے بیان کردہ دونوں شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا۔

عملاً متحارب کفار سے رابطہ رکھنے والوں کی جاسوسی شعبۂ حرب کی ذمہ داری ہے، نیز اُن عوام کی جاسوسی جو حکمی متحارب یا اُن کے نمائندوں سے اُن کے ملک میں خفیہ رابطہ رکھیں، بھی شعبۂ حرب ہی کے دائرے میں آتی ہے۔ اس کے برعکس شعبۂ امنِ داخلی اُن لوگوں کی جاسوسی کرتا ہے جو اسلامی ریاست ہی میں حکمی متحارب کفار یا اُن کے نمائندوں سے مشکوک رابطے رکھیں۔

ساتواں:

شعبۂ خارجہ

شعبۂ خارجہ اُن تمام بیرونی معاملات کا ذمہ دار ہوتا ہے جو ریاستِ خلافت کے دیگر ریاستوں کے ساتھ تعلقات سے متعلق ہوں، خواہ اُن تعلقات اور معاملات کی نوعیت کیسی بھی ہو۔ خواہ ان کی نوعیت سیاسی ہو جیسا کہ مفاہمتیں، معاہدات، جنگ بندی، مذاکرات، سفیروں کا باہم تبادلہ، پیامبر اور وفود بھیجنا، سفارت خانوں اور قونصل خانوں کا قیام؛ اور خواہ ان کی نوعیت اقتصادی ہو جیسا کہ زراعت، تجارت، ڈاک یا ٹیلیفون یا لہروں کے ذریعے کمیونیکیشن وغیرہ۔ چونکہ اِن تمام کا تعلق ریاستِ خلافت کے بیرونی ریاستوں کے ساتھ تعلقات سے ہے لہٰذا اِن تمام امور پر محکمہ خارجہ نگران اور ذمہ دار ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ بیرونی دنیا کے ممالک اور ڈھانچوں (entities) سے رابطہ رکھا کرتے تھے جسے ہم معاونِ تنفیذ کی بحث میں بیان کر چکے ہیں۔ آپ ﷺ نے عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو قریش سے گفت وشنید کے لیے روانہ کیا، اور آپ ﷺ نے بذات خود قریش کے نمائندوں سے مذاکرات کیے، اسی طرح آپ ﷺ نے مختلف بادشاہوں کی طرف اپنے سفیر بھیجے نیز بادشاہوں اور امراء کے سفیروں کو قبول کیا اور اُن سے مذاکرات اور معاہدے کئے تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے بعد آپ کے خلفاء نے بیرونی دنیا کے ممالک اور entities سے سیاسی رابطے قائم کئے اور اس کام کیلئے اُنھوں نے لوگ مقرر کئے جو ان کے نائب کے طور پر یہ کام انجام دیتے تھے کیونکہ جو کام ایک شخص بذاتِ خود انجام دے سکتا ہے، اسے اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی اور کو اس کام کیلئے اپنا نائب یا

وکیل مقرر کردے۔

بین الاقوامی سیاست کی پیچیدگیوں کے مدِ نظر اور بین الاقوامی سیاسی رابطوں میں وسعت وتنوع کے پیشِ نظر ہم یہ تبنی کرتے ہیں کہ خلیفہ بین الاقوامی رابطوں سے متعلق امور کے لیے ایک مخصوص شعبہ یا ادارہ قائم کرے اور جس پر خلیفہ ریاست کے دوسرے محکموں کی طرح براہِ راست یا معاونِ تنفیذ کے توسط سے شریعت کے مخصوص احکام کے مطابق نگران ہوگا۔

آٹھواں:

صنعت

شعبہ صنعت وہ شعبہ ہے جو ریاست میں صنعت سے متعلق تمام امور پر ذمہ دار ہوتا ہے، خواہ یہ بھاری صنعت ہو جیسے موٹروں، انجنوں، آلات، گاڑیوں کے ڈھانچوں کی تیاری، خام مواد کی صنعت، الیکٹرانک ساز وسامان کی صنعت وغیرہ یا یہ ہلکی صنعت کاری ہو۔ اسی طرح خواہ صنعتیں عوامی ملکیت کے دائرے میں آتی ہوں یا انفرادی ملکیت کے ضمن میں آتی ہوں یا پھر وہ صنعتیں ہوں جو جنگی ساز وسامان بناتی ہوں، ان سب کا جنگی پالیسی پر مبنی ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ جہاد وقتال کیلئے فوج ضروری ہے اور فوج کو قتال کیلئے اسلحہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ فوج کیلئے اعلیٰ درجہ کے اسلحہ کی متواتر فراہمی کو یقینی بنانے کیلئے ازحد ضروری ہے کہ اسلحہ کی صنعت ریاست ہی کے اندر ہو، خاص طور پر فوجی صنعت، کیونکہ اس کا جہاد سے براہِ راست تعلق ہے۔

اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ اسلامی ریاست کے امور اس کے اپنے ہاتھ میں ہوں اور اس پر دیگر ممالک کا اثر ورسوخ نہ ہو، ریاست کے لیے لازمی ہے کہ وہ بذاتِ خود اسلحہ سازی کرے اور اسے بہتر سے بہتر بنائے۔ یہ امر ریاست کو خودمختار بنائے گا اور وہ ہر وقت جدید ترین اور اعلیٰ ترین اسلحے کی حامل ہوگی، اس بات سے قطع نظر کہ اسلحہ کی جدت اور معیار کتنا ہی اعلیٰ ہو جائے۔ اسلامی ریاست کے پاس وہ اسلحہ موجود ہوگا جس کے ذریعے وہ ہر ظاہری اور ممکنہ دشمن پر اپنی دھاک بٹھا سکے گی۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ

وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَ هُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ﴾

''اورتم اپنی مقدور بھر قوت اور گھوڑوں کو ان کیلئے تیار رکھو، تا کہ اس سے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ کرو اور اس کے سوا اُن کو بھی جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے'' (الانفال :60)

یوں ریاست اپنے اختیار اور مرضی کے مطابق ایسا اسلحہ تیار کرے گی جس کی اسے ضرورت ہو اور اس میں مسلسل بہتری لائے گی تا کہ اس کے پاس اعلیٰ ترین اور جدید ترین اسلحہ ہو، تا کہ وہ تمام ظاہری اور ممکنہ دشمنوں پر رعب و دہشت قائم رکھ سکے۔ چنانچہ یہ ریاست پر فرض ہے کہ وہ بذاتِ خود اسلحہ سازی کرے اور اسکے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اسلحے کیلئے دیگر ریاستوں پر انحصار کرے کیونکہ دیگر ریاستوں پر انحصار ان ریاستوں کو یہ موقع فراہم کرے گا کہ وہ اسلامی ریاست کے ارادے، اس کی اسلحہ سازی اور جہاد کو کنٹرول کریں۔

وہ ریاستیں جو دوسری ریاستوں کو اسلحہ فروخت کرتی ہیں وہ عموماً ہر قسم کا اسلحہ فروخت نہیں کرتیں خاص طور پر طور پر جدید تکنیک والا ایسا اسلحہ جو جدید ترین ہو۔ نیز اسلحہ کی فروخت کے ساتھ کچھ شرائط منسلک ہوتی ہیں جس میں اس اسلحے کا استعمال بھی شامل ہے اور یہ اسلحہ ایک خاص تعداد اور مقدار میں فروخت کیا جاتا ہے جس کا تعین خریدنے والے ملک کی بجائے اسلحہ فروخت کرنے والی ریاستیں خود کرتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں اسلحہ فروخت کرنے والی ریاستوں کو اسلحہ خریدنے والی ریاست پر اختیار اور اثر ورسوخ حاصل ہو جاتا ہے اور وہ اسلحہ خریدنے والی ریاست پر اپنی مرضی ٹھونسنے کے قابل ہو جاتی ہیں، خاص طور پر اس وقت جب یہ ریاست حالتِ جنگ میں ہو۔ جنگ کی صورت حال میں اس ریاست کو مزید اسلحے، فاضل پرزوں اور گولہ بارود کی ضرورت ہوتی ہے جس کے نتیجے میں اس ریاست کا اسلحہ بیچنے والی ریاست پر انحصار مزید بڑھ جاتا ہے اور وہ اس کے مطالبات کے سامنے مزید سرنگوں ہو جاتی ہے۔ یوں اسلحہ فروخت کرنے والی ریاست اس قابل ہوتی ہے کہ وہ خریدنے والی ریاست اور اس کے ارادے کو کنٹرول کر سکے، خاص طور پر حالتِ جنگ میں اور اس وقت جب اسے اسلحے اور فاضل پرزوں کی اشد ضرورت ہو۔ پس ایسی ریاست خود کو اور اپنے ارادے اور وجود کو اسلحہ فروخت کرنے والے ممالک کے ہاتھوں گروی رکھ دیتی ہے۔

لہٰذا اسلامی ریاست کیلئے یہ واجب ہوگا کہ وہ اسلحہ اور قتال میں کام آنے والے ضروری آلات اور اُن کے پرزوں کی صنعت کاری خود ہی کرے، اور ریاست تب ہی ایسا کرنے پر قادر ہوگی جب اس کے پاس بھاری صنعت ہو اور وہ ایسی فیکٹریاں تعمیر کرے جو فوجی اور غیر فوجی دونوں طرح کی بھاری مشینیں بناتی ہوں۔ چنانچہ ریاست کیلئے ناگزیر ہوگا کہ اُس کے ہر طرح کے ایٹمی اسلحے، ہوائی جہاز، میزائیل، مصنوعی سیارے، بکتر بند ٹینک، توپیں، جنگی جہاز، مختلف اقسام کے ہلکے اور بھاری اسلحے بنانے کی فیکٹریاں موجود ہوں۔ ریاست کیلئے یہ بھی لازمی ہے کہ اس کے پاس ایسی فیکٹریاں ہوں جو مشینیں، موٹریں، الیکٹرونک ساز و سامان بناتی ہوں، اور میٹیریل سازی کرتی ہوں، اور ایسی فیکٹریاں ہوں جن کا تعلق ملکیتِ عامہ سے ہے اور ایسی فیکٹریاں جو ہلکا ساز و سامان بناتی ہیں۔ یہ سب اس تیاری کے لیے درکار ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾

''اور تم اپنی مقدور بھر قوت کو ان کیلئے تیار رکھو'' (الانفال:60)

چونکہ اسلامی ریاست پیغامِ اسلام کو سارے عالم میں دعوت و جہاد کے ذریعہ پہنچانے کی مکلّف ہوتی ہے، لہٰذا یہ ریاست دائمی طور پر جہاد کیلئے تیار رہتی ہے، جس کا تقاضا ہے کہ ریاست میں ثقیل و خفیف دونوں قسم کی صنعت جنگی پالیسی پر مبنی ہو تاکہ ضرورت پڑنے پر ان کارخانوں کو سہولت کے ساتھ جنگی مقاصد کے مطابق ڈھالا کیا جا سکے۔ پس یہ لازم ہے کہ ریاستِ خلافت کی تمام تر صنعت جنگی پالیسی کی بنیاد پر استوار ہو خواہ وہ اس میں بھاری اشیاء تیار ہوتی ہوں یا یہ ہلکی صنعت کاری ہو تاکہ جب ریاست کو ضرورت ہو تو اِن کارخانوں کو جنگی اشیاء بنانے کی طرف منتقل کیا جا سکے۔

عدلیہ

عدلیہ کسی معاملے پر فیصلہ صادر کرتی ہے تا کہ اسے نافذ کیا جائے۔ وہ لوگوں کے درمیان جھگڑوں کو نبٹاتی ہے یا اُس چیز کو روکتی ہے جس سے معاشرہ کے حق کو نقصان پہنچتا ہے، نیز یہ عوام اور کسی بھی ایسے شخص کے درمیان نزاع کا فیصلہ کرتی ہے جس کا تعلق ریاست سے ہو، خواہ وہ حاکم ہو یا کوئی ریاستی ملازم، خلیفہ ہو یا کوئی اور۔

قضاء کی بنیاد اور حقیقت کتاب وسنت سے واضح ہوتی ہے۔ جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق ہے، تو ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾

''آپ ان کے معاملات میں اللہ کی نازل کردہ احکامات کے مطابق ہی فیصلہ کریں'' (المائدہ:49)

﴿وَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ﴾

''اور جب انہیں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف بلایا جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے'' (النور:48)

جہاں تک سنت کا تعلق ہے، رسول اللہ ﷺ قضاء کے منصب پر بنفس نفیس فائز تھے اور وہ لوگوں کے درمیان احکامات جاری فرمایا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے قاضی بھی مقرر فرمائے، چنانچہ آپ ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنایا اور اُنہیں قضاء سے متعلق ہدایات دیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

((إذا تقاضا إليك رجلان فلا تقض للأول حتى تسمع كلام الآخر فسوف تدري كيف تقضي))

''جب تمہارے پاس دولوگ کوئی معاملہ لے کر آئیں تو اس وقت تک فیصلہ نہ کرو جب تک دوسرے شخص کی بھی بات نہ سن لو، پس تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ کیسے فیصلہ کرنا ہے'' (ترمذی)

احمد کی روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((إذا جلس إليك الخصمان فلا تكلّم حتى تسمع من الآخر كما سمعت من الأول))

''جب تمہارے سامنے دوفریق بیٹھیں تو اس وقت تک نہ بولو جب تک دوسرے کی بات بھی اسی طرح نہ سن لو، جیسے پہلے کی سنی تھی''

اِسی طرح رسول اللہ ﷺ نے معاذ رضی اللہ عنہ کو الجُند کا قاضی مقرر فرمایا تھا، چنانچہ مندرجہ بالا تمام احادیث عدلیہ کے جواز کیلئے دلیل ٹھہرتی ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ لوگوں کے درمیان تنازعات کا رفع کرنا عدلیہ کی تعریف میں داخل ہے پس حسبہ بھی اسی میں شامل ہے۔ حسبہ کی تعریف یوں کی گئی ہے:

(الإخبار بالحكم الشرعي على سبيل الإلزام فيما يضر حق الجماعة)

''معاشرے کے حقوق کو جن امور سے ضرر پہنچتا ہو، اُن کے متعلق شرعی حکم کو بیان کرنا جس کا نفاذ لازمی ہو''

صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اناج کے ڈھیر کے متعلق حدیث سے اس تعریف کی تائید ہوتی ہے، جس میں بیان ہے:

((أنَّ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم مَرَّ على صُبْرَة طعام فأدخَلَ يَدَهُ فيها فَنَالَت أصابعهُ بللاً، فقال: ما هذا يا صاحب الطعام؟ فقال: أصابته السماء يا رسول اللهﷺ، فقال: أفلا جَعَلْتَهُ فوق الطعام كي يراه الناس، مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ

مِنّي))

''رسول اللہ ﷺ بازار میں غلہ کے ایک ڈھیر کے قریب سے گزرے تو اپنا ہاتھ اُس ڈھیر کے اندر ڈالا اور آپ ﷺ کی انگلیاں بھیگے ہوئے غلے کی وجہ سے نَم ہوگئیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے اناج فروش، یہ کیا ہے؟ اُس شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ، یہ آسمان (یعنی بارش) کی وجہ سے ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو اِس بھیگے ہوئے حصہ کو اوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ سکیں؟ جو دھوکہ دے وہ مجھ میں سے نہیں!''

اسی طرح عدلیہ کے ضمن میں مظالم کے امور بھی داخل ہیں جو کہ حکام کے خلاف شکایتوں پر مشتمل ہوتے ہیں، مظالم کی تعریف یوں وارد ہوئی ہے:

(الإخبار بالحكم الشرعي على سبيل الإلزام فيما يقع بين الناس و بين الخليفة أو أحد معاونيه،أو ولاته أو موظفيه،و فيما يقع بين المسلمين من اختلاف في معنى نصّ من نصوص الشرع الَّذى يراد القضاء بحسبها والحكم بموجبها)

''عوام اور خلیفہ یا اُس کے کسی معاون یا والی یا ملازم کے مابین تنازعہ، نیز مسلمانوں کے درمیان نصوص شریعت میں سے کوئی ایسی نص کہ جس کے مطابق فیصلہ کیا جائے یا اس کے بموجب حکم صادر کیا جائے، کے معنی ومفہوم کے بارے میں اختلاف، کے متعلق شرعی حکم کی خبر دینا جس کا نفاذ لازمی ہو''

مظالم کا تذکرہ رسول اللہ ﷺ کی اُس حدیث میں بھی وارد ہوا ہے جو اشیاء کے نرخ متعین کرنے کے بارے میں ہے، آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((... و إنّي لأرجو أن ألقى اللّٰه،ولا يطلبني أحد بِمَظْلِمَة ظلمتها إياهُ في دمٍ ولا مالٍ))

اور میں چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن اللہ سے اس حالت میں ملوں گا کہ کوئی میرے خلاف یہ دعویٰ نہ کرے کہ میں نے اس پر مَظْلَمَہ کیا ہے، خون میں یا مال میں'' (رواہ احمد عن طریق انسؓ)

اس سے یہ معلوم ہوا کہ حاکم، والی یا کسی ملازم کے کسی مَظْلَمَہ کا معاملہ جب کوئی شخص اُٹھائے تو وہ قاضیٔ مظالم کے پاس جائیگا جو اُس پر فیصلہ صادر کریگا اور جو قابلِ نفاذ ہوگا۔ لہٰذا قضاء یعنی عدلیہ کی جامع تعریف میں یہ تینوں چیزیں شامل ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل سے ثابت ہیں، یعنی لوگوں کے درمیان تنازعات کے فیصلے، معاشرہ کو نقصان پہنچانے والی ہر چیز کو روکنا اور عوام اور حکام کے درمیان، یا عوام اور حکومتی ملازمین کے درمیان تنازعات کا فیصلہ۔

قاضیوں کی اقسام:

قاضی کی تین اقسام ہیں: اول: القاضی، جو معاملات اور عقوبات میں لوگوں کے درمیان ہونے والے تنازعات کا فیصلہ کرتا ہے۔ دوسرا قاضی محتسب، جو اُن مخالفات (offences) کے فیصلے کرتا ہے جن سے معاشرہ کے حق کو ضرر پہنچتا ہو، اور تیسرا قاضی مظالم، جو عوام اور ریاست کے درمیان ہونے والے تنازعات کا فیصلہ کرتا ہے۔

یہ ہیں قاضیوں کی تین اقسام۔ جہاں تک القاضی، یعنی جو لوگوں کے درمیان خصومات کو رفع کرتا ہے، کے لیے دلیل کا تعلق ہے تو یہ رسول اللہ ﷺ کے عمل اور رسول اللہ ﷺ کے معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنائے جانے سے ثابت ہے۔ جہاں تک قاضی محتسب، جو معاشرے کے حق کو ضرر پہنچنے سے روکتا ہے، کے لیے دلیل کا تعلق ہے تو یہ بھی رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل سے ثابت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّي))

''جو دھوکہ دے وہ مجھ میں سے نہیں''

یہ اُس حدیث کا حصہ ہے جو امام احمد نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ دھوکہ دینے والے سے معارضہ کرتے تھے اور انہیں سزا دیا کرتے تھے۔ احمد نے قیس ابن ابی غرزہ الکنانی سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم مدینہ میں مال تھوک سے خریدا کرتے تھے اور خود کو وسیط یا دلال کہتے تھے، رسول اللہ ﷺ بازار آئے اور ہمیں ایک بہتر نام سے پکارا، آپ نے ارشاد

فرمایا:

((یا معشر التجار، إن هذا البیع یحضره اللغو والحلف، فشوبوه بالصدقة))

''اے تاجرو! تجارت میں لغویات ہوتی ہیں اور قسمیں کھائی جاتی ہیں، پس اسے صدقہ کے ذریعے پاک کرلو''

اِسی طرح امام احمد نے ابی منہال سے روایت کیا ہے:

(أن زید بن أرقم و البراء بن عازب کانا شریکین، فاشتریا فضة بنقد و نسیئة، فبلغ ذلك النبي ﷺ فأمرهما أن ما کان بنقد فأجیزوه، وما کان بنسیئة فردوه)

''زید ابن ارقم اور براء بن عازب باہم شریک (پارٹنر) تھے، انہوں نے چاندی خریدی، جس کا کچھ حصہ نقد تھا اور کچھ اُدھار۔ جب یہ اطلاع رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے نقد خرید کو جائز قرار دیا اور اُدھار والی کو روک دیا اور کہا کہ اسے واپس کردو۔

چنانچہ یوں آپ ﷺ نے ادھار کے سودے سے انہیں روک دیا۔ یہ تمام معاملات عدلیہ کی اس قسم سے متعلق ہیں، جو حسبہ کہلاتی ہے۔ حسبہ اُس عدلیہ کا نام ہے جو معاشرہ کے حق کو نقصان پہنچانے والے معاملہ میں فیصلہ دیتی ہو۔ حسبہ ریاستِ اسلامی میں ایک متعین اصطلاح ہے جس کے ذیل میں تاجروں اور دستکاروں پر نگرانی کی جاتی ہے تاکہ اُنہیں اپنی تجارت، کام اور مال میں لوگوں کو دھوکہ دینے سے باز رکھا جائے، اُن سے صحیح ناپ، ماپ اور تول وغیرہ کی پابندی کروائی جائے، کہ ایسا نہ ہونے سے معاشرہ کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو آپ ﷺ نے بذاتِ خود کیا اور اِس کا حکم دیا، جیسا کہ براء بن عازب والی حدیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فریقین کو ادھار والی چاندی کے سودے سے منع فرمایا۔ طبقات ابنِ سعد اور ابن عبدالبر کی الاستیعاب میں منقول ہے کہ فتح مکہ کے بعد آپ ﷺ نے سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو مکہ کے بازار پر متعین کیا تھا۔ چنانچہ حسبہ کا رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ثابت ہونا واضح ہے۔ اسی طرح عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے قبیلہ کی ایک خاتون 'الشفاء' کو جو ام سلیمان بن ابی حثمہ کے نام سے معروف تھیں، مدینہ کے بازار پر قاضی

محتسب مقرر کیا اور عبداللہ بن عتبہ کو بھی مدینہ کے بازار پر متعین کیا، یعنی قاضیٔ حسبہ مقرر کیا۔ اسے امام مالک نے مؤطا میں اور امام شافعی نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔ مزید یہ کہ عمرؓ بذاتِ خود بازار کا گشت لگاتے تھے اور حسبہ سے متعلق فیصلے کیا کرتے تھے، جیسا کہ خود رسول اللہ ﷺ کا عمل تھا۔ تمام خلفاء کا اسی پر عمل رہا یہاں تک کہ المہدی کے دورِ خلافت میں حسبہ عدلیہ کی ایک مستقل شاخ کے طور پر علیحدہ محکمہ بن گیا۔ ہارون الرشید کے دور میں قاضی حسبہ بازار کا دورہ کیا کرتے تھے، ناپ تول کے پیمانوں کی جانچ کرتے تھے تاکہ لوگوں کو دھوکہ نہ ہو اور تاجروں کے معاملات کی خبر گیری بھی کرتے تھے۔

اور جہاں تک قاضی مظالم کے لیے دلیل کا تعلق ہے تو اِس کی دلیل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾

''پھر اگر کسی چیز میں تم اختلاف کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو'' (النساء:59)

یہ ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اس حکم کے بعد آیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾

''اے لوگو! جو ایمان لائے، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اُن کی جو تم میں صاحب امر ہیں'' (النساء:59)

لہٰذا عوام اور حاکم یعنی اولی الامر کے درمیان جو بھی نزاع ہو، یہ لازم ہے کہ اُسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹایا جائے، یعنی اللہ کے حکم کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک قاضی ہو جو اس نزاع میں حکم جاری کرے، یعنی قاضی مظالم۔ کیونکہ مظالم کی تعریف میں رعایا اور خلیفہ کے درمیان نزاع کے معاملات شامل ہیں۔ اِس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا قول اور فعل دونوں ہیں، البتہ آپ ﷺ نے مخصوص طور پر مظالم کیلئے پوری ریاست میں کوئی مخصوص قاضی مقرر نہیں فرمایا تھا، اور آپ کے خلفاء بھی اس شعبہ میں خود ہی فیصلے کیا کرتے تھے۔ اور یہی عمل علیؓ کے وقت بھی رہا۔ علیؓ نے اس کام کیلئے کوئی وقت مخصوص نہیں کر رکھا تھا اور نہ ہی کوئی

مخصوص طریقہ کار وضع کیا تھا، بلکہ جب بھی کوئی ایسا حادثہ پیش آتا، جو مظالم کی تعریف میں آتا ہو، اُس وقت وہ اس میں حکم دیا کرتے تھے، گویا کہ مظالم کے فیصلے اُن کی عمومی ذمہ داریوں میں شامل تھے۔ عبدالملک ابن مروان وہ پہلے خلیفہ تھے جنہوں نے مظالم کے معاملات کیلئے ایک دن مختص کر لیا تھا اور اس کے کیلئے ایک مخصوص طریقہ بھی اپنایا تھا۔ اسی دن وہ مظلمہ کے معاملات دیکھا کرتے تھے۔ جب کوئی ایسا معاملہ مظالم کے ذیل میں پیش آتا جسے وہ خود نہیں حل کر پاتے تو ایسے معاملہ کو وہ ایک قاضی کو بھیج دیتے تھے جو اُس پر فیصلہ دیتا۔ اس کے بعد خلفاء نے خاص نمائندے مقرر کرنا شروع کر دیے جو مظالم کے معاملات دیکھا کرتے تھے اور اُن کیلئے مخصوص اسلوب وضع ہوئے۔ اسے 'دار العدل' کہا جاتا تھا۔ یہ جائز عمل ہے کیونکہ خلیفہ پر جو بھی ذمہ داریاں ہوتی ہیں، اُس کیلئے جائز ہے کہ وہ انہیں انجام دینے کیلئے اپنے نائب مقرر کرے۔ اسی طرح اِس کام کیلئے وقت اور اسلوب مخصوص کر لینا بھی جائز ہے کیونکہ یہ سب مباح کے دائرہ میں آتا ہے۔

قاضیوں کیلئے شرائط:

جسے قاضی کے عہدہ پر مقرر کیا جائے اُس کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ مسلم، آزاد، بالغ، عاقل، عادل اور فقیہ ہو نیز وہ احکامات کا حقیقتِ حال پر انطباق کرنا جانتا ہو۔ اس کے علاوہ جو شخص قاضی مظالم بنے تو اُس کے لیے قاضی قضاۃ کی طرح اِن شرائط کے ساتھ ساتھ مرد، اور مجتہد ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ اس عہدے کا حکم عدلیہ اور حکمرانی کا سا ہے کیونکہ وہ حکمرانوں کے معاملات کا فیصلہ کرتا ہے اور اُن پر شریعت کو نافذ کرتا ہے، لہٰذا اُس کا باقی شرائط کے ساتھ ساتھ مرد ہونا بھی ضروری ہے۔ اگرچہ قاضیوں کے لیے شرط ہے کہ وہ فقیہ ہو، لیکن قاضی مظالم کیلئے مجتہد ہونا بھی ضروری ہے، کیونکہ قاضی مظالم کی ذمہ داریوں میں یہ دیکھنا بھی شامل ہے کہ کہیں حکمران اللہ کے نازل کردہ احکام کے سوا اور کسی حکم کو تو نافذ نہیں کر رہا، یعنی کوئی ایسا قانون تو نافذ نہیں ہو رہا جس کی کوئی شرعی دلیل نہ ہو یا حاکم جس دلیل سے استدلال کر رہا ہے وہ دلیل کہیں ایسی تو نہیں کہ جس کا

واقعہ پر انطباق، شرعی نہ ہو۔ ایسے معاملات کا صرف ایک مجتہد ہی فیصلہ کرسکتا ہے اور اگر فیصلہ کرنے والا مجتہد نہ ہوتو وہ فیصلہ جہالت کا فیصلہ ہوگا جو کہ حرام ہے۔ چنانچہ قاضی مظالم کیلئے حاکم اور قاضی کی شرائط کے علاوہ مجتہد ہونا لازمی ہوتا ہے۔

قاضیوں کی تقرری:

یہ جائز ہے کہ قاضی، قاضی محتسب اور قاضی مظالم کی تقرری عام ہو، یعنی پوری ریاست اور تمام معاملات پر ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ تقرری کسی مخصوص علاقہ یا مخصوص نوعیت کے معاملات تک محدود ہو۔ یہ دونوں صورتیں رسول اللہ ﷺ کے فعل سے اخذ کی گئیں ہیں۔ آپ ﷺ نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی، اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کے ایک مخصوص علاقہ کا قاضی مقرر فرمایا تھا، جبکہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ایک مخصوص نوعیت کے معاملہ پر قاضی بنایا تھا۔

قاضیوں کی تنخواہیں:

حافظ ابن حجر فتح الباری میں کہتے ہیں کہ رزق (بمعنی تنخواہ) وہ ہوتا ہے جو خلیفہ مسلمانوں کے امور کی نگہداشت کرنے والوں کیلئے بیت المال سے مقرر کرے اور عدلیہ اُن شعبوں میں شامل ہے جن کیلئے بیت المال سے رزق لیا جاسکتا ہے کیونکہ عدلیہ وہ شعبہ ہے جس میں مسلمانوں کی مصلحت کیلئے ریاست قاضیوں کو اجرت پر مقرر کرتی ہے۔ ریاست مسلمانوں کی مصلحت کے پیش نظر کسی بھی کام کیلئے لوگوں کو اجرت پر مقرر کرتی ہے جو اُس کام کو صحیح شرعی طریقہ سے انجام دے سکتے ہوں۔ ہر وہ شخص جو ایسے کسی بھی کام پر مامور کیا جائے، رزق یا تنخواہ کا مستحق ہوتا ہے خواہ یہ کام عبادات سے متعلق ہو یا عبادات کے علاوہ ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے صدقات وصول کرنے والوں کو بھی صدقات میں شریک بنایا ہے، چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا﴾

''جو اس کام پر مامور ہوں'' (التوبہ:60)

ابوداؤد اور ابنِ خزیمہ نے اپنی صحیح میں نیز بیہقی اور حاکم نے شیخین کی شرط پر بریدہ ﷺ سے نقل کیا ہے جس سے ذہبی نے اتفاق کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أیما عامل استعملناہ و فرضنا لہ رزقاً، فما أصاب بعد رزقہ فھو غلول))

''ہم جب کسی شخص کو کسی کام پر مقرر کریں اور اُس کیلئے اجرت یا تنخواہ مقرر کر دیں، تو اُس کے بعد وہ جو کچھ اضافی حاصل کرے وہ دھوکہ (غلول) ہے''

الماوردی اپنی تصنیف **الحاوی** میں تحریر کرتے ہیں: ''عدلیہ اُن امور میں شامل ہے جن کیلئے بیت المال سے رزق یا تنخواہ لی جا سکتی ہے، کیونکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ایسے افراد کو جو صدقات کی وصولی پر مقرر ہوں، زکوٰۃ میں حصہ دار بنایا ہے۔ عمر ﷺ نے شریح کو قاضی کے طور پر متعین کیا اور اُن کیلئے ماہانہ سو درہم بطور تنخواہ مقرر کیے اور جب خلافت علی بن ابی طالب ﷺ کو ملی تو اُنہوں نے اس تنخواہ کو بڑھا کر پانچ سو درہم ماہانہ کر دیا اور زید بن ثابت ﷺ نے بھی قاضی کے عہدے پر فائز ہونے کی تنخواہ حاصل کی۔'' اسی کے متعلق امام بخاری نے اپنی رائے میں بیان کیا ہے کہ: ''شریح قاضی ہونے کی حیثیت سے تنخواہ لیا کرتے تھے۔'' اور امام بخاری کی رائے پر حافظ ابن حجر نے اپنی رائے یوں لکھی ہے: ''شریح کے بارے میں سعید بن منصور، سفیان سے اور سفیان مجاہد سے شعبی کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ مسروق قاضی کے عہدے کی تنخواہ نہیں لیا کرتے تھے جبکہ شریح تنخواہ لیا کرتے تھے۔'' حافظ اپنی کتاب فتح الباری میں ذکر کرتے ہیں: ''ابنِ منذر نے بتایا کہ زید بن ثابت ﷺ قاضی کے عہدے کی تنخواہ لیا کرتے تھے۔'' نیز طبقات ابنِ سعد میں نافع ﷺ سے روایت نقل ہے: ''عمر بن الخطاب ﷺ نے زید ابن ثابت ﷺ کو قضاء کیلئے متعین فرمایا اور اُن کیلئے تنخواہ مقرر کی۔'' الغرض عدلیہ کیلئے تنخواہ حاصل کرنے پر صحابہ کرامؓ اور اُن کے بعد بھی اجماع رہا ہے۔ حافظ اپنی کتاب فتح الباری میں تحریر کرتے ہیں: ''ابوعلی الکرابیسی کا قول ہے کہ ''اہلِ علم اور جلیل القدر صحابہ اور اُن کے بعد اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ قاضی کیلئے اِس عہدے پر فائز ہونے کی اجرت لینے میں کوئی حرج نہیں ہے اور یہی فقہا کا بھی قول ہے، اور مجھے نہیں معلوم کہ اس بارے

میں کسی کو بھی اختلاف ہو، البتہ بعض لوگوں کو جن میں مسروق شامل ہیں اجرت لینا ناگوار تھا بہر حال میں نہیں جانتا کہ کسی نے بھی اس کو حرام بتایا ہو۔'' ابنِ قدامہ اپنی تصنیف المغنی میں لکھتے ہیں: ''عمر رضی اللہ عنہ نے جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو شام بھیجا تو اُنھیں خط لکھا کہ وہ وہاں صالح لوگوں کو منتخب کریں اور اُنھیں قضاء کے کام پر رکھیں، نیز اللہ کے مال میں سے اُن کی کفالت کریں، اُنھیں اجرت دیں اور اُن کی تنگی دور کریں۔''

عدالتوں کی تشکیل:

یہ جائز نہیں ہے کہ کسی بھی عدالت میں ایک سے زیادہ قاضی ہوں، جنہیں فیصلہ کرنے کا اختیار ہو۔ البتہ یہ جائز ہے کہ قاضی کے ساتھ ایک یا ایک سے زیادہ قاضی عدالت میں ہوں، لیکن اُن اضافی قاضیوں کو فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہوتا، وہ صرف رائے اور مشورہ دے سکتے ہیں اور فیصلہ کرنے والا قاضی اِن آراء کو قبول کرنے کا پابند بھی نہیں ہوتا۔

اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی بھی معاملے میں ایک سے زیادہ قاضی متعین نہیں فرمائے، بلکہ ایک معاملہ کے لئے ایک ہی قاضی مقرر فرمایا۔ مزید یہ کہ نظامِ عدل حقیقت میں حکمِ شرعی کی ایسی خبر ہے جس کا نفاذ ہونا لازم ہے، اور ایک مسلمان کیلئے ایک معاملہ میں حکم شرعی ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہوتا ہے چنانچہ یہ ایک ہی ہوتا ہے اور ایک سے زیادہ ہرگز نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُس کے متعدد مفہوم ہو سکتے ہیں لیکن ایک مسلمان کیلئے، جہاں تک اُس حکم پر عمل کا تعلق ہے ،ایک ہی ہوسکتا ہے اُس سے زیادہ قطعاً نہیں۔ کسی حکم کا جو مفہوم ایک مسلمان سمجھتا ہے وہی اُس کے حق میں اللہ کا حکم ہے۔ لہٰذا قاضی جب کسی معاملہ میں اللہ کا حکم سناتا ہے، جس کا تسلیم کرنا اُس شخص پر لازم ہے، تو یہ ضروری ہے کہ یہ ایک ہی حکم ہو، کیونکہ اللہ کے حکم کے مطابق اس فیصلہ (خبر) کو ماننا اُس پر فرض ہے۔ اُس کیلئے اس حکم کو ماننا اور اُس پر عمل کرنا اللہ کے حکم پر عمل کرنا ہوتا ہے اور کسی بھی معاملہ میں اللہ کا حکم ایک ہی ہے، اگرچہ کہ اُس حکم کے متعدد مفاہیم موجود ہوں۔ چنانچہ یہ صحیح نہیں کہ کسی ایک معاملے میں ایک سے زیادہ افراد قاضی ہوں۔ تاہم یہ جائز ہے کہ ایک ہی

علاقہ میں مختلف طرح کے مقدمات کیلئے علیحدہ عدالتیں ہوں، کیونکہ عدلیہ درحقیقت خلیفہ کی نیابت ہے اور نمائندگی کی طرح اس میں بھی ایک سے زیادہ کی اجازت ہے۔ چنانچہ ایک ہی علاقہ میں ایک سے زیادہ قاضی بھی ہو سکتے ہیں اور اگر فریقین میں اس بات پر ٹھن جائے کہ کس عدالت میں مقدمہ جائے، تو مدعی کا حق ہوگا کہ وہ جس عدالت میں چاہے جائے کیونکہ وہ حق کا طالب ہے اور اس معاملہ میں مدعی کی پسند مدعا علیہ کی پسند پر غالب ہوگی۔

قاضی کیلئے یہ جائز نہیں کہ وہ عدالت کے علاوہ کہیں اور فیصلہ دے، اسی طرح قسم اور ثبوت وہی معتبر ہونگے جو عدالت میں دیئے جائیں۔ اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہے، عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((قضى رسول اللّٰه ﷺ أن الخصمين يقعدان بين يدي الحاكم))

''رسول اللہ ﷺ کا حکم ہے کہ دونوں فریق قاضی کے سامنے بیٹھیں'' (مسند احمد و سنن ابوداؤد)

یہ حدیث اس ہیئت کو بیان کر رہی ہے کہ جس میں عدالتی کاروائی ہونی چاہئے، اور یہ ہئیت بذاتِ خود شرعی ہے، یعنی عدالت کی ایک مخصوص شکل ہوتی ہے کہ جس میں فیصلے کئے جاتے ہیں، جو یہ ہے کہ دونوں فریق قاضی کے سامنے بیٹھیں اور یہی عدالتی مجلس ہوگی، اور ایسا ہونا عدالتی کاروائی کے درست ہونے کے لیے شرط ہے۔ یعنی عدالتی فیصلے کے قانونی ہونے کے لیے لازمی ہے کہ عدالت کی مخصوص مجلس ہو۔ اس ہیئت کی تائید ایک اور حدیث سے ہوتی ہے جس میں علی رضی اللہ عنہ سے نقل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إذا جلس إليك الخصمان، فلا تكلّم حتى تسمع من الآخر كما سمعت من الأول))

''جب تمہارے سامنے دو فریق بیٹھیں تو اس وقت تک نہ بولو جب تک دوسرے کی بات اسی طرح نہ سُن لو جیسے پہلے کی سنی تھی''

اس حدیث میں بھی ((إذا جلس إليك خصمان)) کہا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فیصلے کی صحت اور حلف اُٹھانے کیلئے باقاعدہ عدالتی مجلس کا ہونا شرط ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اليمين على المدعى عليه))

''قسم اٹھانا مدعا علیہ پر ہے'' (راوہ بخاری من طریق ابن عباس)

کوئی شخص عدالت ہی میں مدعا علیہ (defendant) ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ثبوت کا پیش کیا جانا بھی عدالت ہی میں ضروری ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((...ولكن البينة على المدعي، واليمين على من أنكر))

''... لیکن ثبوت پیش کرنے کی ذمہ داری مدعی پر ہے اور قسم اٹھانا اُس پر جو (اُس ثبوت سے) انکار کرے'' (بیہقی)

اور ایک شخص میں مدعی ہونے کی صفت مجلسِ عدالت میں ہی پائی جاتی ہے۔

یہ جائز ہے کہ عدالتوں کے مختلف درجات ہوں جہاں مختلف قسم کے مقدمے پیش ہوں۔ یہ بھی جائز ہے کہ بعض قاضی کسی خاص نوعیت کے اور کسی خاص حد تک کے مقدمات کیلئے مختص کئے جائیں اور دیگر مقدمات دوسری عدالتوں کو بھیج دیئے جائیں۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ عدلیہ خلیفہ کی نائب ہوتی ہے اور یہ وکالۃ کی مانند ہے اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں، اور وکالۃ عام بھی ہوسکتی ہے اور خاص بھی۔ لہٰذا قاضی کا تعین کسی خاص معاملہ کے لیے بھی ہوسکتا ہے، یہ اس طرح کہ اُسے دوسری نوعیت کے مقدمات کو لینے سے روک دیا جائے، اور اُن دوسری قسم کے مقدمات کیلئے دیگر قاضی مقرر کئے جائیں، جبکہ یہ تمام قاضی ایک ہی علاقہ میں ہوں۔ اس سے عدالتوں کے مختلف درجات ہونا ثابت ہوتا ہے اور ایسا ماضی میں ہوتا بھی رہا ہے۔ الماوردی اپنی کتاب 'الأحكام السلطانية' میں لکھتے ہیں: ''ابوعبداللہ الزبیری نے کہا کہ بصرہ میں حکام جامع مسجد میں قاضی مقرر کیا کرتے تھے جو قاضی مسجد کہلاتے تھے، یہ قاضی دوسو درہم اور بیس دینار تک کے معاملات اور نفقات کے معاملات میں فیصلے کیا کرتے تھے۔ یہ قاضی اپنی مقررہ حدوں سے تجاوز نہیں کرتے تھے اور اسی دائرہ میں اپنی ذمہ داریاں نبھاتے تھے''

پھر یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف ایک مخصوص معاملہ کیلئے قاضی کی تقرری فرمائی، جیسا کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی تقرری میں ہوا، اور اسی طرح آپ ﷺ نے تمام انواع کی عدلیہ کیلئے ایک پوری ولایت پر ایک ہی قاضی مقرر فرمایا، جیسا کہ علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی یمن کے قاضی کے طور پر تقرری میں ہوا، جو اِس بات کی دلیل ہے کہ قاضی کی عام اور خاص دونوں طرح تقرری کی جاسکتی ہے۔

ریاستِ خلافت میں اپیل عدالتیں (Appeal & Cessation Courts) نہیں ہوتیں، لہٰذا کسی بھی معاملہ کو نمٹانے کیلئے ایک ہی عدالت ہوتی ہے اور جب قاضی اپنا حکم صادر کردے تو اس کا نفاذ لازم ہوجاتا ہے جسے کسی بھی دوسرے قاضی کا حکم معطل نہیں کرسکتا۔ جس طرح کہ شرعی ضابطہ ہے کہ: (**الإجتهاد لا ينقضه بمثله**) یعنی ''ایک اجتہاد ایسے ہی دوسرے اجتہاد کو باطل نہیں کرتا'' اسی طرح ایک مجتہد دوسرے مجتہد کیلئے حجت نہیں ہوتا۔ لہٰذا ایسی عدالتوں کا ہونا صحیح نہیں جو دیگر عدالتوں کے صادر کردہ احکام کو معطل یا کالعدم کریں۔

البتہ اگر کوئی قاضی شرعی احکام کے مطابق حکم صادر کرنے کو ترک کرکے احکامِ کفر سے حکم صادر کرے، یا کوئی ایسا فیصلہ صادر کرے جو قرآن وسنت کی قطعی نص، یا اجماعِ صحابہ کے مخالف ہو، یا پھر ایسا حکم صادر کرے جو حقیقتِ احوال کے خلاف ہو، مثلاً وہ کسی شخص کو دانستاً قتل کرنے کے جرم میں قصاص کا حکم صادر کردے اور پھر اس کے بعد اصل قاتل آموجود ہو، یا اِن جیسی دوسری صورتیں، تو پھر ایسی صورت میں اس قاضی کے حکم کو منسوخ کیا جاتا ہے، کیونکہ بخاری ومسلم میں عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((من احدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو ردّ))

''جو ہمارے معاملہ (دین) میں کوئی نئی بات ایجاد کرے جو اُس میں نہ ہو، تو وہ قابل ردّ ہے''

نیز اسی طرح جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((أن رجلاً زنى بامرأة، فأمر به النبي ﷺ فجُلِد. ثم أخبر أنه محصن فأمر به فَرُجم))

''ایک شخص نے ایک عورت سے زنا کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اُسے کوڑے لگانے کا حکم دیا، پھر آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ وہ شادی شدہ ہے، تو آپ ﷺ نے اُسے سنگسار کرنے کا حکم دیا''

مالک بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

(بلغني أن عثمان رضی اللہ عنہ أُتي بامرأة ولدت من ستة أشهر فأمر برجمها. فقال له علی رضی اللہ عنہ: ما عليها رجم؛ لأن اللّٰه تعالیٰ يقول:)

''مجھے پتہ چلا کہ ایک عورت کو (نکاح کے) چھ ماہ بعد بچہ ہوا تھا، اور اُسے عثمانؓ کے پاس لایا گیا، اُنہوں نے اسے سنگسار کرنے کی سزا سنائی۔ علی رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا کہ اُسے سنگساری کی سزا نہیں دی جاسکتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

﴿وَحَمْلُهُ وَفِصٰلُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا﴾

''اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے'' (احقاف:15)

اور ارشاد ہے:

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾

''اور جو کوئی پوری مدت تک دودھ پلوانا چاہے تو مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں'' (البقرۃ: 233)

چنانچہ حمل 6 ماہ کا ہوسکتا ہے، لہٰذا اسے سنگسار نہیں کیا جاسکتا، پس عثمان رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ عورت کو واپس لایا جائے'' عبدالرزاق امام ثوری کے بارے میں بتاتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ''اگر قاضی کتاب اللہ، سنتِ رسول یا کسی ایسی چیز کے خلاف فیصلہ دے جس پر (صحابہ کا) اجماع ہے، تو دوسرا قاضی اسے تبدیل کردے''

وہ قاضی جسے (مندرجہ بالا صورتوں میں) کسی قاضی کا فیصلہ تبدیل کرنے کا اختیار ہے، وہ قاضی مظالم ہے۔

محتسب:

قاضی محتسب وہ قاضی ہوتا ہے جسے اُن تمام امور میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہو جو حقوقِ عامہ سے متعلق ہوں، اور یہ معاملات حدود اور تعزیرات کے دائرے میں نہ آتے ہوں، خواہ اس کا کوئی مدعی نہ ہو۔

یہ قاضی محتسب کی وہ تعریف ہے جو بھیگے ہوئے اناج والی حدیث سے ماخوذ ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے گیلے اناج کو اوپر رکھنے کا حکم دیا تا کہ لوگ اُسے دیکھ سکیں۔ یہ حقوقِ عامہ کا معاملہ تھا جس میں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ نَم یا بھیگے ہوئے حصے کو اوپر رکھا جائے تا کہ لوگوں کو دھوکہ نہ ہو۔ اس میں وہ تمام حقوق شامل ہیں جو اس نوعیت کے ہیں، البتہ اس میں حدود اور تعزیرات کے معاملات شامل نہیں ہوتے، کیونکہ وہ اس نوعیت کے نہیں ہوتے اور وہ درحقیقت لوگوں کے آپسی تنازعات ہوتے ہیں۔

قاضی محتسب کے اختیارات:

قاضی محتسب کسی بھی معاملہ میں، جو اُس کے دائرہ اختیار میں آتا ہو، حکم جاری کرتا ہے، اس کے لئے کسی باقاعدہ عدالتی مجلس میں ہی حکم صادر کرنا لازم نہیں۔ قاضی محتسب کے تصرف میں پولیس کا عملہ ہوتا ہے جو اس کے احکامات کو فوراً نافذ کرتا ہے۔

کسی معاملہ میں سنوائی کرنے کیلئے قاضی محتسب کو عدالتی مجلس کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ واقعہ کی خبر ملتے ہی وہ حکم جاری کرسکتا ہے، خواہ کوئی بھی جگہ ہو یا کوئی بھی وقت ہو چنانچہ بازار ہو یا پھر گھر، وہ گھوڑے پر سوار ہو یا موٹر کار میں، رات کا وقت ہو یا پھر دن، وہ فیصلہ کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔ جس طرح دیگر قاضیوں کیلئے عدالت ہی میں کاروائی کا ہونا شرط ہے، قاضی محتسب پر یہ شرط لاگو نہیں ہوتی، کیونکہ جس حدیث میں عدالت اور فریقین کی موجودگی ضروری قرار دی گئی ہے، جیسا کہ:

((إن الخصمين يقعدان بين يدي الحاكم))

''دونوں فریق قاضی کے سامنے بیٹھیں''

((إذا جلس إليك الخصمان ...))

''جب تمہارے سامنے دو فریق بیٹھیں...''

تو قاضی محتسب پر اس شرط کا اطلاق نہیں ہوتا، کیونکہ حسبہ کے معاملات میں مدعی اور مدعا علیہ نہیں ہوتا، صرف ایک حق عام ہوتا ہے جسے نقصان پہنچا ہو، یا شرع کی کوئی خلاف ورزی سرزد ہوئی ہو۔ مزید یہ کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ نے گیلے اناج والے معاملہ میں حکم جاری کیا تو آپ ﷺ بازار میں گشت پر تھے اور سامان نظر کے سامنے تھا۔ آپ ﷺ نے اُس دوکان دار کو کسی مجلس میں طلب نہیں فرمایا، بلکہ وہیں موقع واردات پر ہی حکم جاری فرمایا جو اس بات کی دلیل ہے کہ محتسب کے لیے کسی معاملہ کی سنوائی کیلئے مخصوص عدالتی مجلس کا ہونا ضروری نہیں۔

اِسی طرح قاضی محتسب کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے نائب منتخب کرے جن میں وہ شرائط موجود ہوں جو ایک قاضی محتسب کیلئے درکار ہیں۔ محتسب اُنہیں مختلف علاقوں کیلئے مقرر کر سکتا ہے۔ یہ قاضی اپنے لئے مقرر کردہ علاقوں میں اور مقررہ معاملات میں حسبہ کی ذمہ داریاں ادا کر سکتے ہیں۔

البتہ قاضی محتسب کا یہ اختیار کہ وہ مزید محتسب مقرر کر سکتا ہے، اس امر سے مشروط ہوگا کہ آیا خود اُس کی تقرری کے وقت اُسے اپنے نمائندہ محتسب مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا تھا یا نہیں، اگر اسے یہ حق استخلاف نہیں دیا گیا تھا تو پھر محتسب کو دیگر محتسب مقرر کرنے کا حق نہیں ہوتا۔

قاضی مظالم:

قاضی مظالم وہ قاضی ہوتا ہے جسے کسی بھی شخص کے خلاف ریاست کی طرف سے ہونے والے ہر مظلمہ کو روکنے کے لیے متعین کیا گیا ہو، چاہے یہ شخص ریاست کا شہری ہو یا اُس کی اتھارٹی کے تحت رہ رہا ہو اور چاہے اُس مظلمہ کا مرتکب خلیفہ بذاتِ خود ہو یا اُس کے ماتحت کام کرنے

والا، یعنی کوئی حاکم یا سرکاری ملازمین۔

یہ تو تھی قاضی مظالم کی تعریف اور جہاں تک مظالم کورٹس کی اصل کا تعلق ہے تو اِس کی وضاحت انس ﷺ کی حدیث سے ہوتی ہے کہ حکمران کے ذریعہ کسی ناحق امر سے عوام کو ضرر پہنچنے کا نام مظلمہ ہے۔ انس ﷺ نے فرمایا: رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں ایک بار اشیاء کی قیمتوں میں گرانی آ گئی تو لوگوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ ''اے اللہ کے رسول ﷺ آپ قیمتیں مقرر فرما دیجئے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إن اللّٰه هو الخالق القابض الباسط الرازق المسعر، و إني لأرجو أن ألقى اللّٰه ولا يطلبني أحد بمظلمة ظلمتها إياه في دمٍ ولا مال))

''بیشک اللہ ہی خالق، قابض، دولت کو بڑھانے والا، رازق اور قیمتیں طے کرنے والا ہے، میں یہ امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملوں کہ کوئی مجھ سے کسی مظلمہ کا مطالبہ کرنے والا نہ ہو، خواہ جان کا یا مال کا'' (مسند احمد)

لہٰذا آپ ﷺ نے قیمتوں کے (صاحبِ مال کی بجائے کسی اور کی جانب سے) طے کرنے کو مظلمہ قرار دیا، یعنی اگر آپ ﷺ قیمتوں کو مقرر کر دیتے تو یہ ایسا فعل ہوتا جس کا آپ ﷺ کو حق نہ تھا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے وہ حقوقِ عام جنہیں ریاست منظّم کرتی ہے، اُن میں تنازعہ کو مظلمہ قرار دیا۔ لہٰذا عوامی امور کی نگہداشت کیلئے ادارے قائم ہوں اور رعایا میں کسی کو یہ لگے کہ وہ ادارہ اُس کے حق میں ظلم کر رہا ہے، تو یہ معاملہ مظالم کے ضمن میں آ جاتا ہے، مثلاً زرعی زمین کی مشترکہ (یعنی ملکیتِ عامہ کے) پانی سے باری باری آبپاشی، جو کہ ریاست نے طے کر دی ہو۔

اس کی دلیل وہ معاملہ ہے جب ریاست نے پانی سے زمین کو باری باری سیراب کرنے کا نظام مقرر کیا تھا جو یہ تھا کہ جس شخص کی زمین سے پانی کی دھار پہلے گزر رہی ہو، پہلے وہ اپنی زمین کی آبپاشی کا حقدار ہے، اور ایک انصاری نے اس کے متعلق شکایت کی تھی۔ انصاری یہ چاہتا تھا کہ زبیر ﷺ پہلے پانی کو ان کی زمین کی طرف پھیر دیں اور پھر اپنی زمین کی آبپاشی کریں،

جبکہ پانی کی دھار پہلے زبیر ؓ کی زمین سے گزر رہی تھی۔ زبیر ؓ نے اس بات سے انکار کر دیا اور یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے پاس فیصلہ کیلئے پیش ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ پہلے زبیر ؓ اپنی زمین پر ہلکی سی آبپاشی کر لیں اور پھر پانی کے بہاؤ کو اپنے پڑوسی انصاری کی زمین کی جانب کر دیں۔ یعنی وہ انصاری کی مدد کی خاطر اپنی باری کا پورا استعمال نہ کریں۔ انصاری کو یہ فیصلہ منظور نہ تھا، وہ چاہتے تھے کہ زبیر ؓ اپنی زمین کی آبپاشی سے قبل ہی پانی کو اُس کی زمین کی جانب پھیر دیں۔ اس پر اُس انصاری نے کہا کہ آپ نے ایسا فیصلہ اس لئے دیا کہ زبیر آپ کے چچازاد بھائی ہیں۔ (یہ بات فی الحقیقت رسول اللہ ﷺ کے حضور بہت بڑی جرات تھی لیکن آپ ﷺ نے شاید انصاری صحابی کو جنگِ بدر میں شریک ہونے کے سبب درگزر کر دیا، جیسا کہ بخاری کی روایت میں آتا ہے)۔ انصاری کے اس قول پر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ پہلے زبیر اپنے حق کا پورا پانی استعمال کریں اور اپنی زمین کو پانی دیں، یہاں تک کہ پانی دیوار تک یا درختوں کے تنے تک آ جائے۔ اس کی تفسیر میں علماء نے لکھا ہے کہ یعنی پانی انسان کے پیروں کو ڈھانک لے۔ مسلم نے عروہ بن زبیر ؓ سے اس پوری حدیث کو نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن زبیر ؓ نے اُنھیں بتایا:

(أنَّ رجلاً من الانصار خاصم الزبير عند رسول اللّٰه ﷺ فی شراج الحرّةِ التي يسقون بها النخل، فقال الأنصاری سَرِّح الماءَ يمرُّ، فَأبی عليهم، فاختصموا عند رسول اللّٰه ﷺ، فقال رسول اللّٰه ﷺ للزبير: "اسق يا زبير ثم ارسل الماءَ اِلی جارِكَ" فغضب الأنصاریُّ فقال أن كان ابن عمتك فتلوَّ وجه نبی اللّٰه ﷺ ثم قال: "يا زبير اسق ثم احبس الماءَ حتی يرجع اِلی الجَدْرِ")

''انصاریوں میں سے ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے زبیر سے اپنی مخاصمت کا معاملہ پیش کیا جو پانی کے بہاؤ یا دھار سے متعلق تھا، جس سے وہ دونوں اپنی اپنی زمین سیراب کرتے تھے اور انصاری نے زبیر ؓ سے کہا تھا کہ وہ پانی کو اُس کی زمین کی جانب بہنے دیں جس پر زبیر ؓ نے انکار کر دیا تھا اور یوں یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش ہوا۔ رسول اللہ ﷺ نے زبیر ؓ سے

فرمایا کہ ''پہلے تم اپنی زمین کو سیراب کرلو پھر پڑوسی کی زمین کی جانب بہاؤ موڑ دو۔'' اس پر وہ انصاری غصے میں آ گیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! یہ اس لئے کہ وہ آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدل گیا اور پھر آپ ﷺ نے زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ''اے زبیر پہلے تم اپنی زمین کو سیراب کرو اور پانی کو روک لو یہاں تک کہ تنوں تک پانی آ جائے''۔

زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ یہ آیت اسی بارے میں نازل ہوئی ہے:

﴿فَلاَ وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا﴾

''(اے محمد ﷺ) آپ کے رب کی قسم! یہ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک یہ آپ ﷺ کو اپنے باہمی اختلافات میں فیصلہ کرنے والا نہ بنالیں، پھر جب آپ ﷺ فیصلہ کر دیں تو یہ اپنے اندر کوئی گرانی محسوس نہ کریں، بلکہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں'' (النساء: 65)

حدیث میں شراج کے معنی پانی کے بہاؤ کے ہیں اور الحرۃ مدینہ کا ایک معروف مقام ہے، جہاں کا یہ واقعہ ہے، ابوعبید کہتے ہیں کہ مدینہ میں دو ندیاں ہوا کرتی تھیں جن میں بارش کا پانی بھرا رہتا تھا اور لوگ اس پانی کے استعمال کیلئے ایک دوسرے سے مقابلہ کیا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا پہلے والے پہلے، یعنی بہاؤ کے شروع میں رہنے والے پہلے استعمال کریں پھر بعد والے لوگ۔

لہٰذا ہر وہ شخص جو کسی ناانصافی کا شکار ہوا ہو، خواہ حاکم کی جانب سے یا ریاست کے مختلف اداروں کی طرف سے یا پھر کسی حکم کے نتیجے میں، وہ مظلمہ تصور کیا جائے گا جیسا کہ سابقہ دونوں احادیث سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ مظلمہ خلیفہ یا اُس کے ذریعہ نامزد کئے ہوئے مخصوص ادارے یعنی محکمۂ المظالم کے سامنے فیصلہ کیلئے پیش ہوگا۔

قاضی مظالم کی تقرری اور اس کی معزولی:

قاضی مظالم کی تقرری خلیفہ یا قاضی القضاۃ ہی کر سکتے ہیں کیونکہ مظالم کورٹس عدلیہ ہی کے ضمن میں آتی ہیں اوران کا کام بھی حکمِ شرعی کی خبر دینا ہے جس کا نفاذ لازمی ہوتا ہے، اور تمام قسم کے قاضیوں کا تقرر خلیفہ ہی کی جانب سے ہوتا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے ایسا ہی ثابت ہے جیسا کہ گزشتہ صفحات پر ہم دیکھ چکے ہیں کہ آپ ﷺ ہی قاضیوں کو متعین فرماتے تھے۔ چنانچہ قاضی مظالم کا تقرر خلیفہ ہی کی جانب سے ہوتا ہے اسی طرح اگر قاضی القضاۃ کو قاضی مظالم کو مقرر کرنے کا حق اس کی تقرری کے وقت دیا گیا ہو تو قاضی القضاۃ کے ذریعہ بھی قاضی مظالم کا تقرر کیا جانا جائز ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ریاست کے مرکز میں قائم مظالم کورٹ ہی خلیفہ، خلیفہ کے معاونین اور قاضی القضاۃ کے خلاف مظلمہ کی شکایتوں کی سماعت کرے، جبکہ تمام ولایات میں اس کی پھیلی ہوئی شاخیں والی، عاملین اور ریاست کے دیگر ملازمین کی طرف سے ہونے والے مظلمہ کے معاملات کی سماعت کریں، نیز خلیفہ کو یہ اختیار بھی ہے کہ وہ مرکزی محکمۃ المظالم کو یہ حق دے دے کہ وہ اپنی ذیلی شاخوں کے لیے قاضی مظالم کا تقرر کر سکتے ہیں اور انہیں معزول کر سکتے ہیں۔

ریاست کے مرکزی محکمۃ المظالم کے اراکین کی تقرری اور برطرفی کا اختیار صرف خلیفہ ہی کو ہوتا ہے۔ البتہ مرکزی محکمۃ المظالم کا امیر خلیفہ ہی کے خلاف مظلمہ کی سماعت کر رہا ہو، تو اگرچہ اصولی طور پر تمام قاضیوں کی طرح اُس کی تقرری اور معزولی بھی فی الحقیقت خلیفہ ہی کا اختیار ہوتا ہے، تاہم اس مخصوص صورتِ حال میں بھی اُس قاضی مظالم کی برطرفی کا اختیار خلیفہ ہی پر چھوڑ دیا جائے تو غالب گمان یہ ہے کہ یہ اختیار حرام کا باعث بن جائے گا، لہٰذا اس صورتِ حال میں اِس شرعی قاعدہ (**الوسیلة الی الحرام حرام**) ''یعنی وہ چیز جو حرام کی طرف لے جائے، از خود بھی حرام ہو جاتی ہے'' کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور اس قاعدے کے انطباق کیلئے غالب گمان کا ہونا ہی کافی ہے۔

ایسی صورتِ حال اُس وقت ہوتی ہے جب خلیفہ، اُس کے معاونین یا قاضی القضاۃ کے خلاف مظلمہ کا معاملہ اُٹھایا گیا ہو؛ اس میں قاضی القضاۃ بھی صرف اس وقت میں شامل ہے جب خلیفہ نے اسے قاضی مظالم کی تقرری اور معزولی کا اختیار سونپ رکھا ہو۔ ایسی صورتِ حال

میں قاضی مظالم کی برطرفی کے اختیار کا خلیفہ کے ہاتھ میں ہونا قاضی کے فیصلے پر اثر انداز ہوسکتا ہے اور قاضی مظالم کی طرف سے خلیفہ یا اُس کے معاونین کو معزول کر دینے کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے، چنانچہ اس صورتِ حال میں قاضی مظالم کی برطرفی کا اختیار وسیلۂ حرام ہے، پس اس صورتِ حال میں اس اختیار کا خلیفہ کے ہاتھ میں ہونا حرام ہے۔

اس مخصوص صورتِ حال کے علاوہ یہ اختیار اپنی اصل جگہ ہی رہے گا، یعنی قاضیٔ مظالم کی برطرفی کا اختیار خلیفہ ہی کے پاس ہوگا، بالکل اسی طرح جیسا کہ اُسے قاضی مظالم کی تقرری کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

محکمۃ المظالم کے اختیارات:

محکمۃ المظالم کو کسی بھی قسم کے مظلمہ کے کیس کو سننے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ خواہ وہ کیس ریاستی ڈھانچوں اور اداروں کے کسی بھی شخص سے متعلق ہو یا خلیفہ کی جانب سے کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی سے متعلق ہو یا ریاست کے دستور وقوانین کی تشریح سے متعلق ہو یا وہ خلیفہ کے تبنی شدہ کسی شرعی حکم سے تعلق رکھتا ہو یا عوام کی بہبود کے ریاستی اداروں کے قوانین سے متعلق ہو یا کسی ٹیکس کے عائد کئے جانے سے تعلق رکھتا ہو یا پھر اس طرح کا کوئی بھی معاملہ ہو۔

ریاست کے کسی ملازم کی طرف سے کوئی مظلمہ یا خلیفہ کی طرف سے شریعت کی خلاف ورزی یا خلیفہ کے تبنی شدہ دستور وقوانین یا قانونی مصدر کا مفہوم یا ٹیکس کا نفاذ یا ریاست کی جانب سے عوام کے حقوق کی پامالی جیسے اُن کی زمینیں ہتھیانا، ریاست کی جانب سے ملازمین اور سپاہیوں کی تنخواہوں میں کمی کرنا، اُن کی ادائیگی میں تاخیر کرنا وغیرہ؛ اِن تمام مظلمہ کے معاملات میں باقاعدہ عدالتی مجلس کا ہونا، مدعی علیہ کو طلب کیا جانا یا خود مدعی کا موجود ہونا شرط نہیں، بلکہ محکمۃ المظالم کا یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی مظلمہ کا تدارک کرے خواہ کسی نے بھی وہ معاملہ پیش نہ کیا ہو، یعنی ازخود (Suo moto) کارروائی کی جائے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ مقدمات کیلئے عدالتی مجلس ہونے کی جو شرط ہے اس کا اطلاق مظالم کی عدالت پر نہیں ہوتا کیونکہ یہاں کسی مدعی کی موجودگی ضروری نہیں ہوتی، مظالم کورٹس بغیر کسی مدعی کے کسی بھی مظلمہ پر غور کر سکتی ہیں اور نہ ہی یہاں مدعا علیہ کو پیش ہونا ضروری ہے جب کہ عدالت مظلمہ کی تفتیش کر رہی ہو، چنانچہ باقاعدہ مجلس کے انعقاد کی ضرورت کی دلیل مظالم کی عدالت پر منطبق نہیں ہوتی، کہ جس کے متعلق رسول اللہ سے مروی یہ احادیث موجود ہیں:

((إن الخصمين يقعدان بين يدي الحاكم))

''دونوں فریق قاضی کے سامنے بیٹھیں'' (مسند احمد وسنن ابوداؤد)

((إذا جلس إليك الخصمان...))

''جب تمہارے سامنے دو فریق بیٹھیں...''

لہٰذا محکمۃ المظالم کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ جیسے ہی کوئی مظلمہ واقع ہو، وہ وقت، جگہ اور باقاعدہ مجلس ہونے کی شرط کے بغیر اس پر غور کرے۔ محکمۃ المظالم کے اس مقام کی وجہ سے اسے عظمت و ہیبت حاصل رہی ہے۔ مصر و شام میں سلاطین کے عہد میں مجلسِ سلطان، جہاں مظالم کے معاملات سنے جاتے تھے، دار العدل کہلاتی تھی۔ جہاں سلطان کے نمائندے اس کی نمائندگی کرتے تھے اور فقہا اور قاضیان وہاں موجود رہا کرتے تھے۔ المقریزی اپنی کتاب 'السلوک إلى معرفة دول الملوک' میں لکھتے ہیں کہ سلطان الملک الصالح ایوب نے دار العدل میں مظالم کے ازالہ کیلئے اپنا نمائندہ مقرر کر رکھا تھا، جہاں قاضیان، فقہا آیا کرتے تھے اور گواہ موجود ہوتے تھے۔ محکمۃ المظالم کیلئے ایسی عالیشان عمارت تعمیر کرانا، جس سے اس محکمہ کی عظمت ظاہر ہو، میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ یہ مباح امور میں سے ہے۔

قیامِ خلافت سے پیشتر کے معاملات، مقدمات اور سودے:

ایسے معاملات، سودے (Contracts) اور عدالتی فیصلے، جو نظامِ خلافت قائم ہونے سے قبل طے کیے گئے اور اُن کا نفاذ بھی ہو چکا، اِنھیں طرفین کے درمیان صحیح تصور کیا جائے گا، چنانچہ

ریاستِ خلافت اپنے قیام کے بعد ایسے معاملات پر نہ تو روک لگائے گی اور نہ اِنھیں دوبارہ اُٹھایا جائے گا، نیز خلافت کے قائم ہو جانے کے بعد ایسے معاملات کے خلاف کوئی دعوے بھی قبول نہیں کئے جائیں گے۔ البتہ دو اقسام اس سے مستثنیٰ ہوں گی:

1) اگر ایسا کوئی معاملہ جو قیامِ خلافت سے پہلے طے اور نافذ ہو چکا ہو لیکن اُس کے اثرات باقی رہیں اور وہ معاملہ اسلام کے خلاف ہو۔

2) یہ معاملہ اس شخص کے متعلق ہو جس نے اسلام یا مسلمانوں کو نقصان پہنچایا تھا۔

اِن دونوں صورتوں کے ماسوا ایسے معاملات کے نہ اُٹھائے جانے کی دلیل رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے دارالاسلام کے قائم ہو جانے کے بعد ایامِ جاہلیت کے کسی بھی معاملہ یا فیصلے پر روک نہیں لگائی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے بعد اُس گھر پر نہیں گئے جہاں سے ہجرت کی تھی اور قریش کے قانون کے مطابق اس گھر کے وارث عقیل بن ابی طالب تھے اور عقیل بن ابی طالب کا اُن گھروں پر تصرف رہا اور عقیل نے انہیں فروخت کر دیا، اِن میں رسول اللہ ﷺ کا گھر بھی شامل تھا۔ جب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ ﷺ کس گھر پر قیام فرمائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے جواب دیا:

((وَ هَل تَرَکَ لَنَا عقیل من رباع))

''کیا عقیل نے ہمارے لئے کوئی حصہ چھوڑا ہے''

ایک دوسری روایت میں ہے:

((وَ هَل تَرکَ لَنَا عقیل من منزِلٍ))

''کیا عقیل نے ہمارے لئے کوئی گھر چھوڑا ہے''

عقیل رسول اللہ ﷺ کا گھر فروخت کر چکے تھے اور آپ ﷺ نے فتح مکہ کے بعد اُس فروخت کو کالعدم نہیں کیا۔ اس ذیل میں امام بخاری نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے:

((أَنَّهُ قال زَمَن الفتح يا رسول اللّٰه أين تنزل غداً؟ قال النبیﷺ وَ هَل تَركَ لَنَا عقيل من منزلٍ؟!))

''فتح مکہ کے وقت آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول! کل آپ کہاں قیام فرمائیں گے؟ نبی ﷺ نے جواب دیا: ''کیا عقیل نے ہمارے لئے کوئی گھر چھوڑا ہے؟''

اسی طرح یہ بھی روایت منقول ہے کہ زینبؓ جنگِ بدر کے بعد ہجرت کر چکی تھیں اور ان کے شوہر ابوالعاص اپنے شرک کے ساتھ مکہ ہی میں رہ گئے تھے۔ جب دو سال بعد ابوالعاص نے اسلام قبول کر کے مدینہ ہجرت کی تو آپ ﷺ نے اُن کی زوجہ اُنھیں سابقہ نکاح کی تجدید کے بغیر واپس کر دی۔ یہ اُس عقد کا اقرار تھا جو مکہ میں ایام جاہلیت میں ہو چکا تھا۔ ابنِ ماجہ نے عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے:

((أن رسول اللّٰهﷺ ردّ ابنته۔ ای زینب۔ علی ابی العاص ابن ربیع بعد سنتین بنکاحها الأول))

''رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی یعنی زینبؓ کو اُن کے پہلے نکاح کے دو سال بعد ابی العاص ابن ربیع کو واپس کر دیا''

جہاں تک اُن معاملات کا تعلق ہے، جن کا اثر باقی ہو اور جو اسلام کے خلاف ہوں، تو رسول اللہ ﷺ نے اسلامی ریاست کے قائم ہو جانے کے بعد جن لوگوں پر کسی کا سود باقی تھا، اسے ختم کر دیا اور قرض کی اصل رقم کو باقی رکھا۔ یعنی دارالاسلام بن جانے کے بعد سابقہ معاملات کی بنا پر جاری سود کو ختم کر دیا۔ سنن ابی داؤد میں سلیمان بن عمرو نے اپنے والد سے روایت نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ سے سنا:

((ألا إن كل ربا من ربا الجاهلية موضوع لكم رؤوس اموالكم لا تَظْلِمون ولا تُظْلَمون))

''خبردار ایامِ جاہلیت کے تمام سود باطل ہوئے، چنانچہ تمہارے لئے حق صرف تمہاری اصل رقم ہے، نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم ہو''

اسی طرح وہ لوگ جن کی دورِ جاہلیت کے قانون کے مطابق چار سے زیادہ شادیاں چلی آ رہی تھیں، اب دارالاسلام قائم ہو جانے کے بعد وہ پابند بنائے گئے کہ صرف چار بیویوں کو رکھ کر باقی کو چھوڑ دیں۔ ترمذی نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ غیلان ابن سلمہ ثقفی نے جب اسلام قبول کیا تو اُن کی ایامِ جاہلیت سے دس بیویاں تھیں جنھوں نے اُن کے ساتھ اسلام قبول کیا، آپ ﷺ نے اُنھیں حکم دیا کہ وہ ان میں سے چار کا انتخاب کر لیں۔

لہٰذا ایسے معاملات جو اسلام کے خلاف ہوں اور جن کا اثر باقی رہے، تو خلافت کے قیام کے بعد اس اثر کو زائل کر دیا جائے گا اور اس کا زائل کر دیا جانا واجب ہوگا۔

مثال کے طور پر اگر ایک مسلمان خاتون کسی عیسائی سے شادی کئے ہوئے ہو تو خلافت کے قیام کے بعد شریعت کے احکامات کے مطابق اُن کا یہ عقد منقطع ہو جائے گا۔

اور جہاں تک قیامِ خلافت کے بعد ایسے معاملات کو دوبارہ اُٹھانے کا تعلق ہے جو اُن لوگوں سے متعلق ہوں جنھوں نے اسلا]م یا مسلمانوں کو ضرر یا ایذا پہنچائی ہو، تو یہ اس بناء پر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے وقت کچھ افراد کے قتل کا حکم دیا تھا جو ایامِ جاہلیت میں اسلام اور مسلمانوں کو ایذا دیا کرتے تھے اور اس حکم میں یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر وہ کعبہ کے پردوں میں چھپ جائیں تو بھی اُنھیں نہ چھوڑا جائے، یہ معاملہ عمرو بن العاص سے مروی اِس حدیث کے باوجود ہے ،جس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((الاسلام یجب ماقبلہ))

''اسلام اپنے سے قبل تمام (گناہوں) کو ختم کر دیتا ہے'' (احمد، طبرانی)

یعنی جن لوگوں نے اسلام اور مسلمانوں کو ایذا پہنچائی، وہ اس حدیث سے مستثنیٰ ہوں گے۔

چونکہ رسول اللہ ﷺ نے بعد میں کچھ لوگوں مثلاً عکرمہ بن ابوجہل کو معاف کر دیا تھا، لہٰذا خلیفہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے معاملات کو اُٹھائے یا اُن سے درگزر کر دے۔ اس کا

اطلاق اُن لوگوں پر ہوگا جو مسلمانوں کو حق بات کہنے پر ستاتے تھے یا اسلام کے خلاف طعن و تشنیع کرتے تھے، چنانچہ ایسے لوگوں پر اس حدیث کا انطباق نہیں ہوگا جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''اسلام اپنے سے قبل تمام (گناہوں) کو ختم کر دیتا ہے''، بلکہ وہ اس سے مستثنیٰ رہیں گے اور خلیفہ اپنی صوابدید کے مطابق اُن کے معاملہ کو نبٹائے گا۔

ان دونوں صورتوں کے ماسوا ان تمام معاملات، لین دین اور مقدمات کو نہ تو مسترد کیا جائے گا اور نہ ہی انہیں نئے سرے سے شروع کیا جائے جنہیں خلافت کے قائم ہونے سے پہلے طے کر لیا گیا تھا اور جو نافذ بھی ہو چکے ہوں۔

مثال کے طور پر اگر کسی شخص کو ایک سکول کے دروازے یا تالے توڑنے کے الزام میں دو سال قید کی سزا سنائی گئی ہو اور وہ خلافت کے قیام سے قبل اپنی سزا کے دو سال پورے کر کے آزاد ہو چکا ہو۔ تو اب خلافت قائم ہو جانے کے بعد وہ ارادہ کرے کہ وہ سزا دینے والوں پر مقدمہ چلائے کیونکہ اُس کی رائے میں وہ سزا کا مستحق نہیں تھا، تو اس کا دعویٰ قبول نہیں کیا جائے گا، کیونکہ یہ معاملہ یعنی اس پر سزا کا حکم اور پھر سزا کی مدّت خلافت کے قائم ہونے سے پہلے ختم ہو چکی، اور اب یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے کہ وہ اُسے اِس کے بدلے اجر سے نوازدے۔

اس کے برعکس اگر ایک شخص کو دس سال کی سزا کا حکم ہوا ہو اور خلافت کے قیام پر اس سزا کو شروع ہوئے دو سال ہی گزرے ہوں تو یہ خلیفہ کی صوابدید پر ہوگا کہ وہ اس معاملہ پر غور کرے، خواہ وہ اُس کی سزا کو سرے سے خارج کر دے اور اسے الزام سے بری کر کے آزاد کرے یا جتنی سزا وہ کاٹ چکا ہو اُس ہی کو کافی سمجھ کر چھوڑ دیا جائے، یا پھر باقی سزا پر غور کیا جائے اور متعلقہ احکامِ شرعیہ کے تحت فیصلہ کیا جائے، جو عوامی بہبود میں ہو۔ اِن میں خاص کر وہ معاملات ہوں گے جو افراد کے حقوق سے متعلق ہوں اور اُن سے آپسی عداوتوں کا ازالہ ہوتا ہو۔

دسواں:

عوامی بہبود کے انتظامی محکمہ جات

ریاست کے معاملات اور عوام کے مفاد کا انتظام مختلف محکمہ جات اور اداروں کے ذمے ہوتا ہے جن کی ذمہ داری ہے کہ وہ مفادِ عامہ کی دیکھ بھال کے کام کو بخوبی سرانجام دیں۔ ہر مفادِ عامہ کے شعبے کا ایک منتظم اعلیٰ (Director General) ہوتا ہے اور اس کے تحت مختلف کاموں کیلئے علیحدہ ادارے ہوتے ہیں جن کا علیحدہ علیحدہ منتظم (Director) ہوتا ہے جو اس کام کا براہ راست ذمہ دار ہوتا ہے۔ ایسے تمام منتظمین (Directors) اپنے کام کے پیشہ وارانہ پہلو کے اعتبار سے اپنے منتظمِ اعلیٰ کو جوابدہ ہوتے ہیں جبکہ قوانین اور عمومی احکامات کے نفاذ کے پہلو سے اپنے صوبے کے والی اور اپنے شہر کے عامل کے سامنے بھی جوابدہ ہوتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ بذاتِ خود اِن امور کا اہتمام فرماتے تھے اور اداروں کیلئے افسران مقرر فرماتے تھے۔ مدینہ منورہ میں آپ ﷺ عوامی امور کی نگہداشت فرماتے، ان کی مشکلات کا تدارک کرتے اور اُن کے آپسی تعلقات کو منظّم کیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ عوام کی ضروریات کا انتظام فرماتے اور اُنھیں وہ باتیں بتاتے جو اُن کے حق میں بہتر ہوتیں۔ یہ تمام اُن انتظامی امور سے متعلق ہے جو لوگوں کی زندگی کو بغیر کسی رکاوٹ اور مشکلات کے سہل بناتے ہیں۔

چنانچہ تعلیم کے معاملہ میں آپ ﷺ نے قریش کے قیدیوں سے دس دس مسلمانوں کو تعلیم دلوائی، حالانکہ قیدیوں کا فدیہ مویشی ہوا کرتے تھے جو مسلمانوں کی ملکیت بنتے۔ لہٰذا تعلیم کا فراہم کرنا مسلمانوں کے مفادات (مصالح) میں سے ایک مفاد کا اہتمام کرنا تھا۔

اِسی طرح صحتِ عامہ کی سہولیات لوگوں تک پہنچانے کے سلسلے میں کیا گیا، ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک طبیب کو تحفتاً پیش کیا گیا، لیکن آپ ﷺ نے اُسے اپنے لئے نہ رکھا بلکہ اُس طبیب کو تمام مسلمانوں کیلئے عام فرما دیا، جو اِس بات کی دلیل ہے کہ صحتِ عامہ کی سہولیات لوگوں کے مفادات میں سے ایک مفاد ہے۔

اسی طرح عوام الناس کے لیے روزگار کے مہیا کرنے کے معاملہ میں رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو ہدایت دی کہ وہ پہلے ایک رسّی خریدے اور پھر ایک کلہاڑی اور آگ جلانے والی لکڑیاں کاٹ کر اُسے لوگوں کو بیچے، بجائے یہ کہ وہ لوگوں سے بھیک مانگتا پھرے کہ جہاں کوئی دے دیتا ہے اور کوئی نہیں دیتا۔ چنانچہ لوگوں کے روزگار کے مسائل کو حل کرنا بھی عوامی بہبود کے کاموں میں سے ایک کام ہے۔ چنانچہ احمد اور ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے اور امام ترمذی نے حسن بتایا ہے کہ آپ ﷺ کے پاس ایک انصاری شخص آیا اور آپ سے صدقہ مانگا، تو آپ نے دریافت کیا کہ کیا تمہارے گھر میں کچھ ہے؟ اُس شخص نے جواب دیا ''ہاں''، آپ ﷺ نے فرمایا کہ انہیں مجھے لا کر دے دو، اور اُس نے وہ دونوں چیزیں آپ ﷺ کو لا کر دے دیں، آپ نے وہ اشیاء اپنے ہاتھ میں لیں اور لوگوں سے پوچھا کہ اِنھیں کون خریدے گا؟ ایک شخص نے پیشکش کی کہ میں یہ دونوں چیزیں دو درہم کے عوض خریدتا ہوں۔ آپ ﷺ نے وہ اشیاء اس شخص کو سونپ دیں اور دو درہم لے کر اُس انصاری کو دے دیئے اور فرمایا کہ اِن میں سے ایک درہم اپنے اہل وعیال کو دے دو اور دوسرے درہم سے کلہاڑی خرید لاؤ، پھر آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اُس پر دستہ لگایا اور اُس شخص سے فرمایا کہ جا کر لکڑیاں کاٹو اور فروخت کرو اور پندرہ دن تک نہ آنا، اس نے ایسا ہی کیا اور جب وہ آیا تو اُس کے پاس دس درہم جمع تھے۔ نیز بخاری نے رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ روایت کیے ہیں:

((لان یاخذ احدکم احبلة فیاتی بحزمة من حطب علی ظهره فیبیعها فیکف بها وجهه خیراً له من ان یسال الناس اعطوه او منعوه))

''ایک شخص کیلئے یہ بہتر ہے کہ وہ رسّی لے اور لکڑیاں باندھ کر اپنی پیٹھ پر لاد کر لائے اور بیچے اور

سوال کرنے سے باز رہے، یہ لوگوں سے بھیک مانگنے سے بہتر ہے کہ کوئی دے دیتا ہے اور کوئی منع کر دیتا ہے''۔

اسی طرح راستوں کا معاملہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے عہد میں راستوں کو منظّم کیا اور یہ حکم دیا کہ اگر اس معاملہ میں کوئی تنازعہ ہو جائے تو راستوں کی چوڑائی سات زرع (بازو) رکھی جائے۔ بخاری نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے:

((قضى النبي ﷺ إذا تشاجروا في الطريق الميتاء بسبعة أذرع))

''رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ اگر راستہ کے معاملہ میں تنازعہ ہو تو اس کی چوڑائی سات ذرع کے برابر کردو''

مسلم کی نے یہ الفاظ روایت کیے ہیں:

((إذا اختلفتم في الطريق جعل عرضه سبعة أذرع))

''اگر تمہارے درمیان راستہ کے معاملہ میں اختلاف ہو تو اُن کی چوڑائی سات ذرع کردو''

یہ اُس زمانہ کے اعتبار سے معاملات کا اہتمام تھا اور اگر ضرورت اس سے زیادہ کی ہو، تو پھر ضرورت کے مطابق کیا جائے، جیسا کہ امام شافعی کا مذہب ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے راستوں کے معاملہ میں تنازعہ سے منع فرمایا، طبرانی نے جامع الصغیر میں روایت کیا ہے:

((من أخذ من الطريق شبراً طوقه الله يوم القيامة بسبع أرضين))

''جو شخص راستے کی زمین سے ایک بالشت بھر بھی ہڑپ کرلے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس کی گردن میں سات زمینوں کے برابر طوق ڈال دیں گے''

اسی طرح زراعت کی بابت ہے کہ زبیر رضی اللہ عنہ اور انصاری صحابی کے درمیان بہتے پانی سے زمین کی آبپاشی کے معاملہ میں تنازعہ ہوگیا تو آپ ﷺ نے زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

((اسقِ يا زبير ثم ارسل الماء إلى جارك))

''اے زبیر پہلے اپنی زمین کو پانی دو پھر بہاؤ اپنے پڑوسی کی طرف کر دو''

یہ حدیث بخاری و مسلم دونوں میں منقول ہے، اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کے بہبود کے امور سرانجام دیتے تھے اور کسی پیچیدگی کے بغیر نہایت آسانی اور سادگی سے اُن کے مسائل کو حل کرتے تھے۔ اور اس میں آپ ﷺ بعض صحابہ کرامؓ کی مدد بھی حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ رعایا کے مفادات مختلف اداروں کے تحت منظّم ہوں گے جو خلیفہ یا اُس کی طرف سے مقرر کردہ منتظم اعلیٰ کے زیرِ نگرانی ہونگے جو اِن اعمال کی انجام دہی کی قابلیت رکھتا ہو۔ اب چونکہ مفادِ عامہ نہایت وسیع نوعیت کے ہو چکے ہیں اور اِن کی تعداد بھی بہت بڑھ چکی ہے لہٰذا خلیفہ کی ذمہ داریوں میں آسانی پیدا کرنے کی خاطر ہم نے یہ تبنی کی ہے کہ ریاست میں مفادِ عامہ کی نگہداشت کی تنظیم کی جائے، جس کے ذمہ دار قابل منتظمین ہوں، جو ایسے اسلوب اور ذرائع اختیار کریں کہ جس سے ریاست کے شہری زندگی آسانی کے ساتھ بسر کریں اور انہیں ضروری سہولیات کسی پیچیدگی کے بغیر نہایت آسانی اور سادگی سے میسر کی جائیں۔

یہ انتظامی امور مختلف محکمہ جات اور اُن کے ذیلی اداروں پر مشتمل ہونگے۔ یہاں محکمہ سے مراد کسی بھی مخصوص مفاد کی اعلیٰ تنظیم ہے، جیسے شہریت، مواصلات، مالی سکّوں کی ڈھلائی، تعلیم، صحت، زراعت، روزگار اور سڑکیں وغیرہ مختلف مفاداتِ عامہ کیلئے محکمہ جات ہیں۔ اِن میں سے ہر ایک محکمہ اپنے مخصوص کام کا اور اپنے ذیل میں آنے والے اداروں پر نگران ہوگا۔ پھر ہر ذیلی ادارہ اپنے مخصوص کام کا اور اپنے ذیلی شعبوں پر نگران ہوگا اور ہر شعبہ ذیلی شاخوں پر نگران ہوگا۔

اِن تمام محکمہ جات، اداروں اور شعبوں کے قیام کا مقصد ریاست کے امور کو منظّم کرنا اور عوامی بہبود کے کاموں سے عہدہ برآء ہونا ہے۔

ان محکمہ جات اور اداروں کی کارکردگی کو دیکھنے کے لیے ان کے ذمہ داران ہونگے، لہٰذا

ہر مفادِ عامہ کے محکمہ کیلئے ایک منتظمِ اعلیٰ (Director General) ہوگا جو اُس مخصوص محکمہ کے کام کا براہِ راست نگران ہوگا اور اپنے محکمہ کے ذیل میں آنے والے تمام اداروں اور شعبوں کا بھی افسرِ اعلیٰ ہوگا۔ اسی طرح ہر ایک ادارے اور شعبے کے لیے منتظمین ہوں گے جو اپنے اپنے شعبہ کے مخصوص کام کے اور اپنے ذیل میں آنے والی دیگر شاخوں کے نگران ہوں گے۔

مفادِ عامہ کا محکمہ جاتی ڈھانچہ انتظامی اسلوب ہے اور یہ حکمرانی کرنا نہیں ہے:

انتظامی محکمہ جات افعال کی انجام دہی کیلئے اسلوب یا وسیلہ ہوتے ہیں۔ ان کیلئے کسی مخصوص دلیل کی ضرورت نہیں بلکہ اِن کے لیے عام دلیل ہی کافی ہے جو اِن کی اصل کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ چنانچہ ایسا کہنا ٹھیک نہیں کہ یہ اسالیب چونکہ انسانی اعمال ہیں اِس لیے ان میں سے ہر عمل کے لیے شرعی دلیل ہو اور اِنہیں مخصوص احکامِ شریعہ کے مطابق سرانجام دیا جائے۔ اِس کی وجہ یہ ہے اِن اعمال کی اصل کے لیے جو دلیل موجود ہے وہ عمومی نوعیت کی ہے، چنانچہ اس میں وہ تمام افعال شامل ہیں جو اصل کام کی فروع ہیں، البتہ اگر کوئی ایسی دلیل ہو جو اُن میں سے کسی پر بالخصوص منطبق ہوتی ہو، تو پھر وہ کام اُس مخصوص دلیل کے ضمن میں آئے گا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کا حکم ہے:

﴿وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾

''اور زکوٰۃ ادا کرو'' (التوبہ:11)

یہ آیت زکوٰۃ کیلئے عام دلیل ہے، پھر اس اصل سے پھوٹنے والے تفصیلی احکامات کے متعلق دلائل وارد ہوئے ہیں، مثلاً زکوٰۃ کی مقدار، زکوٰۃ جمع کرنے والے عاملین، جن چیزوں پر زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے وغیرہ۔ یہ سب اعمال ﴿وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ ''زکوۃ ادا کرو'' کے ذیل میں آتے ہیں۔ تاہم ان اعمال کو سرانجام دینے کی کیفیت کو بیان نہیں کیا گیا، پس یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ زکوٰۃ کس طرح جمع کی جائے، زکوٰۃ جمع کرنے والے زکوٰۃ لینے پیدل جائیں یا سواری پر، وہ اپنی مدد کیلئے اور لوگوں کو ملازم رکھیں یا نہ رکھیں، وہ ان کا حساب مخصوص رجسٹروں میں کریں یا نہ کریں،

اس کام کیلئے علیحدہ دفتر ہو جس میں زکوٰۃ جمع کرنے والے ساتھ بیٹھیں یا نہیں، وہ اس مال کو جمع کرنے کیلئے ایک خاص مخزن (Warehouse) رکھیں یا نہ رکھیں، یہ مخازن زیر زمین ہوں یا کھلے ہالوں کی طرح، یہ زکوٰۃ تھیلوں میں جمع کی جائے یا صندوقوں میں، وغیرہ۔ یہ اور اس طرح کے دیگر کام ﴿وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾ ''اور زکوٰۃ ادا کرو'' کی ہی شاخیں ہیں اور ان تمام کاموں کی دلیل اسی عام دلیل کے ذیل میں آئے گی۔ کیونکہ ان کے متعلق کوئی مخصوص دلیل وارد نہیں ہوئی اور اسی طرح تمام اسالیب کا معاملہ ہے۔ لہٰذا اسلوب ایک عمل ہے جو کہ ایک اور عمل کی شاخ ہے اور اس اصل (یعنی بنیادی عمل) کی عمومی دلیل موجود ہے۔ جبکہ اس شاخ (فروعی عمل) کی مخصوص دلیل وارد نہیں ہوئی اور اس اصل کی عمومی دلیل اس فروعی عمل کے لیے بھی دلیل ہے۔

لہٰذا انتظامی اسالیب کا کسی بھی دوسرے نظام سے اخذ کرنا جائز ہے ماسوائے اُس وقت جب ایسے اسالیب کے اخذ نہ کرنے کیلئے کوئی مخصوص نص وارد ہوئی ہو۔ اس کے علاوہ اسالیب اختیار کئے جا سکتے ہیں اگر یہ اسالیب انتظامی امور میں سہولت اور رعایا کے مفاد کی نگہداشت کی بہتری کا باعث ہوں، کیونکہ دراصل یہ اسالیب ایسے احکامات نہیں جن کیلئے علیحدہ سے شرعی دلیل کی ضرورت ہو۔ چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ نے ملکیتِ عام، ریاستی ملکیت کے اموال، فوجیوں میں تنخواہیں اور رعایا میں عطیات تقسیم کرنے کیلئے فوجیوں اور رعایا کا اندراج کرایا اور اس کیلئے دیوان (Register) مرتب کرنے کا اسلوب اختیار کیا تھا۔

عابد ابن یحییٰ نے حارث ابن نفیل سے روایت کیا ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے دیوان تشکیل دینے کیلئے مسلمانوں سے مشورہ کیا تو علی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا: ''سال بھر میں جس قدر مال آپ کے پاس جمع ہوتا ہے اُس پورے کو تقسیم کر دیجئے اور اُس میں سے کچھ نہ بچا رکھئے۔'' عثمان رضی اللہ عنہ کا مشورہ تھا: ''میرے خیال سے مال اتنا ہے کہ تمام لوگوں کیلئے کافی ہوگا، اگر ہم یہ حساب نہ رکھیں کہ کس کو دیا گیا اور کسے نہیں ملا تو مجھے خوف ہے کہ یہ معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔'' ولید ابن ہشام بن مغیرہ نے کہا: ''میں ملکِ شام میں تھا اور میں نے وہاں دیکھا کہ وہاں کے بادشاہ دیوان (رجسٹر) رکھتے ہیں جس میں فوجیوں کا شمار ہوتا ہے،'' چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی رائے کو اختیار کیا، اور عقیل ابن ابی

طالب، مخرمہ ابن نوفل اور جبیر ابن مطعم ؓ کو بلایا جو قریش کے امورِ نسب کے ماہر مانے جاتے تھے اور اُن سے فرمایا: ''اکتبوا الناس علی منازلھم'' لوگوں کا گھر گھر کے اعتبار سے اندراج (مردم شماری) کرو''۔

جب اسلام عراق میں آیا تو محصولات اور مصارف کے دیوان پہلے ہی کی طرح چلتے رہے۔ شام میں دیوان لاطینی زبان میں تھا کیونکہ شام پہلے مملکتِ روم کا حصہ تھا اور عراق کا دیوان فارسی میں تھا کیونکہ عراق فارس (ایران) کا حصہ تھا۔ عبدالملک ابن مروان کے عہد میں یعنی 81ھ میں شام کا دیوان عربی میں لکھا جانے لگا۔ پھر مختلف ضرورتوں کیلئے جیسا رعایا کی ضرورت کا تقاضا ہوتا، متعدد دیوان وضع ہوئے۔ فوج میں سپاہیوں کے داخلہ اور اُنہیں تنخواہیں تقسیم کرنے کیلئے دیوان مرتب کیا گیا۔ تمام کاموں کی تفصیل اور اُن کاموں کے اخراجات اور حقوق درج کرنے کیلئے علیحدہ دیوان مرتب کئے گئے۔ اسی طرح والیوں اور عمّال کی تقرری اور معزولی کو ضبطِ قلم کرنے کیلئے مستقل رجسٹر یا دیوان وضع ہوا۔ بیت المال میں آمدنی اور اُس میں سے مختلف مدوں میں ہونے والے اخراجات کو بھی علیحدہ دیوان میں لکھا گیا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح حسبِ حاجت ہر کام کیلئے علیحدہ دیوان بنائے گئے اور ہر دور میں اُن کی شکل با اعتبار ضرورت بدلتی رہی۔

اور ہر ایک دیوان کے لیے ایک افسر متعین کیا گیا جس کے ساتھ کئی دوسرے ملازمین بھی ہوتے تھے، اور کچھ مواقع پر اُس افسر کو اجازت دی گئی کہ وہ دیگر ملازمین کو بذاتِ خود بھرتی کرلے اور کچھ مواقع پر دیگر ملازمین بھی اُسے مہیا کر دیئے گئے۔

لہٰذا دیوان جس کام کیلئے مرتب کئے جا رہے ہوں اُس کام کی نوعیت کے اعتبار سے اُن کا اسلوب مختلف ہوسکتا ہے۔ یہ اسلوب ہر زمانے میں مختلف یا ہر ولایہ اور ہر شہر میں بھی مختلف ہو سکتا ہے۔

اور جہاں تک ریاست کے تمام ملازمین کی ذمہ داری کا تعلق ہے، تو یہ ملازمین ایک

طرف تو ریاست کے شہری ہوتے ہیں اور دوسری طرف اُن کی حیثیت تنخواہ دار ملازمین کی ہوتی ہے۔ چنانچہ بحیثیتِ ملازم یہ لوگ اپنے شعبہ (Section) کے منتظم کو جوابدہ ہوتے ہیں، اور دوسری طرف بحیثیت شہری وہ حکمرانوں چاہے وہ والی ہوں، یا خلیفہ یا پھر خلیفہ کے معاونین ہوں، کو جوابدہ ہوتے ہیں۔ اور یہ ملازمین شرعی احکامات اور ریاست کے انتظامی ڈھانچہ کے قوانین، دونوں کے پابند ہوتے ہیں۔

انتظامی معاملات کی پالیسی:

انتظامی امور کی پالیسی اس امر پر مبنی ہوتی ہے کہ انتظامی معاملات کو سہل رکھا جائے، تمام کاموں کو بغیر کسی غیر ضروری تاخیر یا تنگی کے سرانجام دیا جائے اور انہیں انجام دینے والے لوگ باصلاحیت ہوں۔ یہ پالیسی اس بات سے ماخوذ ہے کہ جو شخص کوئی کام کروانے کا طالب ہوتا ہے اُسے یہ مطلوب ہے کہ یہ کام جلد اور بخوبی پورا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں آتا ہے:

((إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الإِحْسَان على كل شيء، فإذا قتلتم فأحسنوا القتلة، وإذا ذبحتم فأحسنوا الذبح...))

''بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر کام میں عمدگی اور نفاست کو فرض قرار دیا ہے، سو اگر تم قتل کرو تو عمدگی سے قتل کرو اور اگر تم ذبح کرو تو اُس میں بھی عمدگی ہو...'' (مسلم نے شداد ابن اوس سے روایت کیا)

لہٰذا ہر کام میں عمدگی کا شریعت کی طرف سے لحاظ رکھا گیا ہے۔ انتظامیہ کے کاموں میں عمدگی کو یقینی بنانے کیلئے تین چیزیں ناگزیر ہوتی ہیں، نظام کا سہل ہونا، معاملات کا جلد نبٹانا کیونکہ اس سے اُس شخص کو سہولت ہوتی ہے جسے کام مطلوب ہے، تیسرے جو افراد اُس کام کو انجام دینے پر مامور ہوں اُن میں اُس کام کی لیاقت و اہلیت کا ہونا۔ اسی اہلیت سے کام میں عمدگی پیدا ہوتی ہے اور کام کی انجام دہی کیلئے یہ ضروری بھی ہے۔

ریاستی انتظامیہ میں ملازمت کے مستحق لوگ:

ہر وہ شخص جو ریاست کا شہری ہے، جس میں متعلقہ کام کی اہلیت ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، مسلم ہو یا غیر مسلم اُسے کسی بھی محکمہ کا منتظم (Director) بنایا جا سکتا ہے یا اُس محکمہ میں ملازم رکھا جا سکتا ہے۔

ایسا اسلام کے اجرت کے متعلق احکامات سے اخذ کیا گیا ہے جہاں اِس بات کی اجازت ہے کہ کسی بھی شخص کو ملازم رکھا جا سکتا ہے چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم، کیونکہ اجرت پر رکھنے کے دلائل عمومی نوعیت کے ہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قول ہے:

﴿فَاِنۡ اَرۡضَعۡنَ لَكُمۡ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ﴾

''اور اگر وہ تمہاری خاطر دودھ پلائیں، تو تم انہیں ان کے معاوضے دے دو'' (طلاق:6)

یہ دلیل عمومی نوعیت کی ہے۔ اسی طرح بخاری نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((قال اللّٰہ تعالیٰ: ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة... و رجل استأجر أجيراً فاستوفى منه ولم يعطه أجره))

''اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ تین قسم کے لوگوں سے قیامت کے دن میری دشمنی ہوگی... ایک وہ شخص جو کسی کو کسی کام کیلئے اجرت پر رکھے، اُس سے وہ کام لے پھر اُسے اجرت نہ دے''

یہ دلیل بھی عمومی نوعیت کی ہے۔ اِسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بذاتِ خود ایک بار بنی الدیل کے ایک شخص کو جو غیر مسلم تھا، اجرت پر رکھا تھا۔ اس سے بھی کسی غیر مسلم کو اجرت پر ملازم رکھنے کے جواز کی دلیل ملتی ہے۔ اسی طرح عورت کو اجرت پر رکھنے کا جواز بھی دلیل کے عام ہونے کی بناء پر ہے۔ چنانچہ عورت کسی محکمہ یا دیوان کی منتظمہ ہو سکتی ہے یا اس میں ملازم ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ایک غیر مسلم کسی محکمہ یا دفتر میں منتظم یا ملازم ہو سکتا ہے کیونکہ یہ اجرت یا اجارہ کا معاملہ ہے اور اس کی دلیل عمومی ہے۔

گیارھواں:

بیت المال

بیت المال کی اصطلاح مرکبِ ترکیبی اضافی ہے جس کا اطلاق اُس مقام کیلئے ہوتا ہے جہاں ریاست کے تمام محصولات اور وارِد ہونے والی اشیاء جمع کر کے رکھی جاتی ہیں اور جہاں سے اُن کو خرچ کیا جاتا ہے۔ اور اس سے مراد وہ ادارتی اتھارٹی بھی ہے جو مسلمانوں کے مستحق اموال کو جمع کر کے رکھنے اور اُنھیں خرچ کرنے پر ذمہ دار ہوتی ہے۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں گزرا کہ ہم نے یہ تبنی کی ہے کہ والیان کو ولایتِ خاص ہی دی جائے، یعنی صوبے کی فوج، قضاء اور مالیات والیوں کے تحت نہیں ہوگی؛ بالفاظِ دیگر تمام افواج کیلئے ایک مرکزی محکمہ (امیر جہاد) ہوگا، تمام قسم کی عدلیہ کیلئے ایک مرکزی محکمہ (قضاء) ہوگا اور اسی طرح تمام مالیاتی امور کیلئے بھی ایک مرکزی ادارہ (بیت المال) ہوگا۔ یہ ادارہ یعنی بیت المال ریاست کے تمام دوسرے اداروں سے علیحدہ ایک مستقل محکمہ ہوگا جس پر ریاست کے دیگر محکموں کی طرح خلیفہ نگراں ہوگا۔

اس بات کے دلائل نہایت کثرت سے ملتے ہیں کہ بیت المال براہِ راست رسول اللہ ﷺ کی نگرانی میں تھا، اور پھر آپ ﷺ کے خلفائے راشدین یا اُن کی جانب سے مقرر کئے ہوئے نمائندے اس کے براہِ راست نگران رہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے خزانچی بھی رکھے تھے اور خود بھی بعض اوقات مال جمع کیا کرتے تھے؛ اسی طرح آپ ﷺ اموال خود وصول فرماتے، خود اس کی تقسیم

کرتے اور خود ہی اسے مناسب جگہ رکھا کرتے؛ جبکہ بعض اوقات اِن امور کی ذمہ داری کسی اور کو بھی سونپ دیتے تھے۔ آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین کا بھی یہی طرزِ عمل رہا، جو یا تو بذاتِ خود بیت المال کے امور کا اہتمام فرماتے یا اِن کی جانب سے مقررہ کردہ نمائندے اس کے نگران ہوتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ یا تو اموال کو مسجد میں رکھتے تھے، یا پھر اپنی ازواج میں سے کسی کے حجرے میں، چنانچہ بخاری میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل ہے کہ جب بحرین سے اموال آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((انثروہ فی المسجد...))

''اسے مسجد میں پھیلا دو...''

نیز اموال کو ازواجِ مطہرات کے حجروں میں رکھنے کے بابت بخاری میں ہی عقبہ سے نقل ہے، وہ کہتے ہیں:

(صلیت وراء النبی ﷺ بالمدینة العصر، فسلم ثم قام مسرعاً، فتخطی رقاب الناس إلی بعض حجر نسائه، ففزع الناس من سرعته، فخرج علیهم، فرأی أنهم عجبوا من سرعته، فقال: ذکرت شیئاً من تبر عندنا، فکرهت أن یحبسنی، فأمرت بقسمته)

''میں نے رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں عصر کی نماز مدینہ میں پڑھی، نماز کے فوراً بعد آپ ﷺ نے لوگوں کو سلام کیا اور نہایت تیزی سے صفوں کو چیرتے ہوئے اپنی ازواجِ مطہرات میں سے بعض کے حجرے کی طرف چل پڑے۔ لوگ آپ ﷺ کی اس سرعت پر تشویش میں تھے، لہٰذا وہ بھی آپ ﷺ کے پیچھے زوجات النبی میں سے ایک کے کمرے کی جانب چلے۔ رسول اللہ ﷺ حجرے سے باہر آئے تو دیکھا کہ لوگ آپ ﷺ کی اس سرعت فکرمند ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے خیال ہوا کہ ہمارے پاس کچھ سونا پڑا ہے، اور مجھے یہ ناگوار ہوا کہ وہ رات بھر میرے پاس پڑا رہے، لہٰذا میں نے اسے تقسیم کرنے کا حکم دے دیا ہے''

رسول اللہ ﷺ کے دور میں مخزن (Store room) تھا، جس کے بارے مسلم کی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے گھر پہنچ کر دریافت کیا کہ آپ ﷺ کہاں ہیں، بتایا گیا کہ آپ ﷺ مخزن میں ہیں، میں وہاں داخل ہوا اور دیکھا کہ وہاں صرف ایک صاع کی مقدار میں جَو تھے، کچھ پتے تھے اور ایک چمڑے کی تھیلی لٹکی ہوئی تھی۔ عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ خستہ حالی دیکھ کر میری آنکھیں نم ہوگئیں اور رسول اللہ ﷺ نے پوچھا کہ اے ابن خطاب کیوں روتے ہو؟ میں نے کہا، اے اللہ کے نبی کیوں نہ روؤں؟ اس چٹائی کے نشان آپ ﷺ کی پیٹھ پر ثبت ہوگئے ہیں اور یہ مخزن میں خالی دیکھ رہا ہوں۔

خلفائے راشدین کے عہد میں اموال کے رکھنے کی جگہ کو بیت المال کہا جانے لگا، طبقات ابنِ سعد میں سہل ابن ابی حثمہ وغیرہ سے نقل ہے کہ ''ابوبکر رضی اللہ عنہ کا بیت المال سنح میں واقع تھا اور اس پر کوئی پہرے دار نہیں تھا، اُن سے کہا گیا کہ آپ وہاں کوئی پہرے دار مقرر کردیں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اُس پر قفل لگا ہوا ہے، اُن کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ مال کو تقسیم کردیا کرتے جب تک ختم نہ ہوجاتا تھا۔ پھر جب آپ مدینہ منتقل ہوئے تو بیت المال اپنے ہی گھر میں کرلیا''۔ نیز ھناد نے الزہد میں انس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے جس کی اسناد جید ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور کہا کہ اے امیر المؤمنین مجھے کچھ عنایت کیجئے میں جہاد پر جانا چاہتا ہوں، عمر رضی اللہ عنہ نے اُس سے کہا کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے اُٹھالے، چنانچہ وہ شخص بیت المال میں داخل ہوا اور جو چاہا لے لیا...''۔ امام شافعی نے اپنی تصنیف الأم میں عبداللہ ابن ودیعہ سے روایت نقل کی ہے جس ابنِ حجر عسقلانی نے صحیح کہا ہے کہ ''سالم جو حذیفہ کے مولیٰ تھے، اور وہ سلمی بنت یعار نامی ایک خاتون کے غلام تھے جنھوں نے ایام جاہلیت میں اُنھیں آزاد کردیا تھا، جب جنگ یمامہ میں شہید ہوئے تو اُن کی میراث عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لائی گئی، عمر رضی اللہ عنہ نے ودیعہ ابن خذام کو طلب کیا اور کہا کہ یہ تمہارے غلام کا ترکہ ہے اور تم لوگ اس کے مستحق ہو، اُنھوں نے کہا کہ اے امیر المؤمنین اللہ تعالیٰ نے ہمیں کافی دیا ہے اور میری بیوی نے انھیں آزاد کر کے چھوڑ دیا دیا تھا چنانچہ ہم نہیں چاہتے کہ ہم اس کے مال پر دعویٰ کریں یا اپنے آپ کو خسارے میں ڈالیں۔ پھر عمر رضی اللہ عنہ نے

اسے بیت المال میں شامل کرلیا''۔

بیہقی اور دارمی نے ایک روایت نقل کی جسے ابنِ حزم نے صحیح کہا ہے'' سفیان ابن عبداللہ بن ربیعہ ثقفی کو چمڑے کی ایک تھیلی ملی جسے لےکر وہ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، عمر رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا کہ ایک سال تک تم لوگوں سے اس کی شناخت کراؤ، اگر شناخت ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ یہ تمہاری ہوئی۔ اُنھوں نے ایسا ہی کیا لیکن اس کی شناخت نہیں ہو پائی، پھر اگلے سال اُنھوں نے عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی یاد دلائی تو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ تمہاری ہوئی، ہمیں اللہ کے رسول ﷺ نے ایسا ہی بتایا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، پھر عمر رضی اللہ عنہ نے اسے بیت المال میں داخل کرلیا'' دارمی نے عبداللہ بن عمرو سے روایت کیا: ''عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک غلام فوت ہو گیا ،اوراس کے کوئی رشتہ دار نہ تھے، تو عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کے مال کو بیت المال میں داخل کرنے کا حکم دیا''۔ عبدالبر اپنی تصنیف **الإستذکار** میں انس ابن سیرین سے روایت کرتے ہیں: '' علی رضی اللہ عنہ تمام اموال کو تقسیم کردیا کرتے تھے یہاں تک کہ بیت المال صاف ہو جاتا، پھر اُس میں ان کے لیے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا اور وہ اس میں بیٹھا کرتے تھے۔''

یہ روایات تو بیت المال کے ایک مخصوص جگہ یا مقام کے اعتبار سے تھیں، جہاں تک ''بیت المال'' کے دوسرے معانی یعنی ذمہ دار اتھارٹی کا تعلق ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اموال ایسے ہوتے ہیں جو کسی مخصوص جگہ رکھے نہیں جا سکتے ،مثلاً زمینیں، تیل اور گیس کے کنوئیں، معدنیات والے پہاڑ یا ایسے اموال جو امیروں سے لےکر غرباء میں تقسیم کردئے جائیں اور جنہیں بیت المال میں رکھنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ چنانچہ ''بیت المال'' کو کبھی ذمہ دار اتھارٹی کے طور پر بھی بولا جاتا تھا، جیسا کہ بیہقی نے سنن میں، امام احمد نے مسند میں اور عبدالرزاق نے اپنی تصنیف میں لاحق ابن حمید سے نقل کیا ہے کہ ''ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو قضاء اور بیت المال کیلئے بھیجا گیا''۔ ظاہر ہے کہ یہ تو ممکن نہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو بیت المال کا پہرے دار بنایا ہو، اس سے مراد یہی ہے کہ انھیں بیت المال کے ادارے پر نگراں مقرر کیا کہ وہ اموال وصول کریں اور اُنھیں تقسیم کریں۔ اسی معنی میں ابن مبارک نے الزہد میں حسن رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ بصرہ کے

امراء ابوموسیٰ الاشعری ؓ کے ہمراہ عمر ؓ کے پاس آئے اور اُن سے گزارش کی کہ وہ اُن کیلئے رزق کا بندوبست کریں، عمر ؓ نے اُن سے گفتگو کی اور آخر میں فرمایا: ''اے جماعتِ امراء، تمہارے لئے بیت المال سے دو بکریاں اور سینچی ہوئی زمین کے دو ٹکڑے مقرر کرتا ہوں۔'' یہاں بیت المال سے مراد بیت المال بمعنی ادارتی اتھارٹی ہے۔

بیت المال کی آمدنی اور اخراجات پر خلیفہ کا اختیار و تصرف ہوتا ہے، چنانچہ جب عثمان ؓ نے جنگِ تبوک کے وقت جیشِ عسرت کیلئے مال دیا تو رسول اللہ ﷺ نے اس مال کو اپنے حجرے ہی میں وصول فرمایا۔ مسند احمد، ترمذی اور حاکم نے عبدالرحمٰن بن سمرہ سے روایت کیا ہے جسے ترمذی نے حسن غریب اور حاکم نے صحیح بتایا ہے اور ذہبی نے اس کی تائید کی ہے، کہتے ہیں کہ جب جیشِ عسرت تیار ہو رہا تھا تو عثمان ؓ رسول اللہ ﷺ کے حجرے میں تشریف لائے اور ایک ہزار دینار رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پیش کئے جسے آپ ﷺ نے وہیں قبول کیا اور آپ ﷺ بار بار فرماتے رہے:

((ما ضر عثمان ما عمل بعد هذا اليوم))

''آج کے بعد عثمان ؓ کچھ بھی کریں اُنھیں اس کا نقصان نہیں''

بعض اوقات اموال کی تقسیم رسول اللہ ﷺ بذاتِ خود ہی فرماتے تھے چنانچہ بخاری میں انس ؓ سے روایت نقل ہے کہ جب بحرین سے اموال آئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((انثروه في المسجد...))

''اسے مسجد میں پھیلا دو...''

پھر جب نماز ختم ہوئی تو آپ ﷺ وہیں بیٹھے اور جس کسی کو دیکھتے اسے اس مال میں سے کچھ نہ کچھ دیتے رہے یہاں تک کہ جب آپ ﷺ اُٹھے تو ایک درہم بھی نہ بچا تھا۔ بخاری میں جابر ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اُن سے وعدہ فرمایا تھا:

((لو قد جاء مال البحرين لقد أعطيتك هكذا وهكذا وهكذا))

''اگر بحرین سے اموال آ گئے ہوتے تو میں تمہیں ایسے ایسے اور ایسے عطا کرتا، یعنی تین بار''

پھر رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد وہ اموال آئے تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا کہ جس کسی کا آپ ﷺ پر قرض باقی ہو یا آپ ﷺ نے کسی سے وعدہ کیا ہو تو وہ آئے۔ چنانچہ جابر رضی اللہ عنہ آگے آئے اور کہا کہ آپ ﷺ نے مجھ سے تین بار دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ جیسا ابھی سفیان ثقفی کی روایت میں گزرا کہ اُنھیں چمڑے کی ایک تھیلی ملی تھی، جو اُنھوں نے عمر رضی اللہ عنہ کو دے دی اور اُنھوں نے بیت المال میں داخل کر لی۔ امام شافعی اپنی تصنیف الأم میں روایت کرتے ہیں کہ ہمیں متعدد اہل علم سے معلوم ہوا ہے کہ جب عراق کے اموال عمر رضی اللہ عنہ کو پیش کئے گئے تو بیت المال کے ذمہ دار نے کہا کہ میں اِنھیں بیت المال میں رکھ دیتا ہوں، عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''نہیں! قسم ہے ربِّ کعبہ کی، جب تک میں اس مال کو تقسیم نہ کر دوں یہ بیت المال کی چھت تلے نہیں جا سکتا۔'' پھر عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ اس مال کو مسجد میں رکھ دیا جائے پھر اُس کو چادر سے ڈھانک کر اس پر انصار و مہاجرین کے پہرے دار مقرر کر دئے گئے۔ اگلے روز صبح عباس رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھامے تشریف لائے اور اس مال کے اوپر سے چادر ہٹائی تو وہ ایسا منظر تھا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا؛ اس میں سونا، یاقوت، اور چمکتے ہوئے موتی تھے جنھیں دیکھ کر عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے۔ اس پر اُن اصحاب میں سے ایک نے کہا کہ بخدا یہ دن رونے کا نہیں بلکہ شکر و سرور کا دن ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''جو تم دیکھ رہے ہو، میں وہ نہیں سوچ رہا بلکہ یہ کہ جب بھی اس قوم میں دولت کی بہتات ہوگی آپس میں اِن کے دل شدید ہو جائیں گے۔ پھر قبلہ کی جانب رُخ کیا اور اپنے ہاتھ اوپر اُٹھا کر فرمایا: ''اے اللہ میں ہلاک کئے جانے سے تیری پناہ مانگتا ہوں میں نے تیرا فرمان سنا ہے کہ:

﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾

''ہم اُنھیں یکے بعد دیگرے وہاں سے ہلاک کریں گے جسے وہ نہیں جانتے'' (الاعراف :182)

پھر آپ رضی اللہ عنہ نے سراقہ بن جعشم کا پوچھا کہ وہ کہاں ہیں؟ اور اُنھیں کسریٰ کے کنگن پیش کئے اور فرمایا کہ اِن کو پہن لو۔ وہ کنگن پہن کر سراقہ بن جعشم نے کہا: ''اللہ اکبر''! عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اللہ اکبر! کہو کہ الحمدللہ جس نے کسریٰ بن ہرمز کے کنگن چھین کر بنی مدلج کے ایک اعرابی سراقہ بن جعشم

کو پہنائے!۔ عمر ؓ عصا سے مال کو پلٹتے جاتے تھے۔ آپؓ نے کہا: جس شخص نے اس مال کو حوالے کیا ہے یقیناً امانت دار شخص ہے۔ تو ایک شخص نے عمر ؓ سے کہا: میں آپ کو بتاتا ہوں، آپ اللہ کی اطاعت کرتے ہیں لہٰذا لوگ آپ کی اطاعت کرتے ہیں۔ آپؓ نے کہا: تم نے سچ کہا۔ پھر آپ نے وہ مال تقسیم کر دیا''۔ اور جیسا ہم نے پہلے بیان کیا کہ سنن دارمی میں عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ عثمان ؓ کے دورِ خلافت میں ایک غلام کا انتقال ہوا اور اُن کا کوئی وارث نہیں تھا تو عثمان ؓ نے حکم دیا کہ اُن کا مال بیت المال میں جمع کر دیا جائے۔ اور الإستذکار میں انس بن سیرین سے مروی ہے کہ علی ؓ تمام اموال تقسیم کر دیا کرتے تھے یہاں تک کہ بیت المال خالی ہو جاتا پھر اُس میں ان کے لیے پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا اور وہ اس میں بیٹھا کرتے تھے۔

بعض اوقات رسول اللہ ﷺ اموال کی تقسیم یا اموال سے متعلق دیگر امور اپنے صحابہ کے ذمہ فرما دیا کرتے تھے، مثلاً بخاری کی یہ حدیث:

((ذکرت شئیاً من تبر عندنا، فکرھت أن یحبسنی، فأمرت بقسمته))

''مجھے خیال ہوا کہ ہمارے پاس کچھ سونا پڑا ہے، اور مجھے یہ ناگوار ہوا کہ وہ میرے پاس پڑا رہے لہٰذا میں نے اسے تقسیم کرنے کا حکم دے دیا ہے''۔

یا ابن شہاب کی یہ روایت جسے ابنِ شبة نے نقل کیا ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی، منذری اور ہیثمی نے اس روایت کو حسن بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بلال ؓ کے مخزن میں داخل ہوئے جہاں صدقات کے اموال رکھے جاتے تھے، وہاں آپ ﷺ نے کچھ کھجوریں رکھی دیکھیں تو بلال ؓ سے پوچھا: اے بلال! یہ کھجوریں کیسی رکھیں ہیں؟ بلال ؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ، یہ میں نے آپ کے وقتِ ضرورت کیلئے اُٹھا رکھیں ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تمہیں یقین ہے کہ تم صبح بخیر اُٹھو گے اور یہ جہنم کی گرمی نہ بنیں گی؟ اِنھیں خرچ کر دو اور آسمانوں کے رب سے قلت یا تنگی کی توقع نہ رکھو۔ اس حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف ؓ اونٹ اور بکریوں کے صدقات اور بلال ؓ پھلوں کے صدقات پر ذمہ دار تھے جبکہ محمیہ ابن جزء ؓ خمس پر مامور تھے۔ خلیفہ کہتے ہیں کہ بلال ؓ رسول اللہ ﷺ کے نفقہ پر مامور تھے۔

ابنِ حبان میں عبداللہ بن لحي سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں مؤذنِ رسول بلال ﷺ سے ملا اور اُن سے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ کا نفقہ کیا تھا؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ اُن کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، جب سے وہ نبی مبعوث ہوئے، اُس وقت سے اُن کی وفات تک میں ہی اُس کی دیکھ بھال کرتا تھا، جب کوئی تنگدست مسلمان آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوتا تو آپ ﷺ مجھے حکم دیتے اور میں کچھ قرض حاصل کر کے اُس کیلئے کپڑا وغیرہ مہیا کرتا اور اسے پہنا اوڑھا کر کھانا کھلاتا تھا۔ مسلم میں رسول اللہ ﷺ کے خادم ابی رافع ﷺ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسی شخص سے ایک اونٹ کا بچہ بطور قرض لیا تھا، پھر جب آپ ﷺ کے پاس صدقہ کے اونٹ آئے تو اُنھوں نے مجھے وہ اونٹ واپس کرنے کا حکم دیا۔ ابی رافع ﷺ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ مجھے کوئی اونٹ کا بچہ نہیں ملا چنانچہ میں نے اس سے بہتر اور چار سال بڑی عمر کا اونٹ واپس کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ اسے عطا کر دو۔ کیونکہ بہترین لوگ وہ ہیں جو قرض کو ادا کرنے میں بہترین ہیں۔ اور ابن عباس سے مروی متفق علیہ حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ نے معاذ ﷺ کو یمن روانہ کیا، تو آپ نے فرمایا:

((... فإن هم أطاعوك، فأعلمهم أن اللّٰه افترض عليهم صدقة تؤخذ من أغنيائهم فترد على فقرائهم، فإن هم أطاعوك لذلك، فإياك و كرائم أموالهم، واتق دعوة المظلوم فإنه ليس بينها وبين اللّٰه حجاب.))

''جب وہ تمہاری بات مان لیں تو اُنہیں بتاؤ کہ اللہ نے اُن پر صدقہ فرض کیا ہے کہ اُن کے امیروں سے وصول کیا جائے اور اُن کے غرباء میں بانٹا جائے، اگر وہ مان لیں تو خبردار اُن کے مال کے بہتر حصہ کو چھوڑ دو اور مظلوم کی آہ سے بچو، کیونکہ اُس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا''

نیز صحیحین میں ابو ہریرہ ﷺ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عمر ﷺ کو صدقہ کی وصولی پر مامور فرمایا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین ﷺ بھی آپ ﷺ ہی کے طرزِ عمل پر کاربند رہے اور اموال کے امور پر اپنے سوا دوسروں کو ذمہ داری دی، چنانچہ ابنِ اسحٰق اور خلیفہ بیان کرتے

ہیں ابوبکر ؓ نے بیت المال کی ذمہ داری ابوعبیدہ بن الجراح ؓ کو سونپی لیکن بعد میں اُنھیں شام بھیج دیا۔ معیقیب کی زندگی کے بیان میں ذہبی کہتے ہیں کہ ابوبکر ؓ اور عمر ؓ نے اُنھیں بیت المال کا ذمہ دار بنایا تھا۔ ابن اسحٰق نے عبداللہ ابن زبیر ؓ سے روایت کیا ہے جسے حاکم نے حسن بتایا ہے، اور جیسا کہ **تراتیب الادارية** کے مصنف نے بیان کیا ہے کہ ابوبکر ؓ نے عبداللہ بن ارقم ؓ کو اپنا کاتب بنایا تھا اور بیت المال کی ذمہ داری سونپی تھی اور عمر ؓ نے اُنھیں اِن دونوں کاموں پر برقرار رکھا۔ ابنِ سعد نے طبقات میں اور ابنِ حجر نے الاصابہ میں نقل کیا ہے کہ عمر ؓ نے اپنے غلام یسار بن نمیر کو اپنا خزانچی مقرر کیا تھا۔ امام احمد نے اپنی مسند میں اور عبد الرزاق نے **المصنف** میں لاحق بن حمید سے روایت کیا ہے کہ ابن مسعود ؓ کو بیت المال اور (کوفہ میں) قضاء کی ذمہ داریاں دی گئی تھیں۔ یہی بات خلیفہ مالک ابن انس ؓ سے اور وہ زید ابن اسلم ؓ سے روایت کرتے ہیں کہ عمر ؓ نے عبداللہ ابن ارقم ؓ کو بیت المال کی ذمہ داری سونپی تھی۔ ابن خزیمہ اپنی صحیح میں عروہ ابن زبیر ؓ سے اس بات کی تخریج کی ہے کہ عبدالرحمٰن بن عبدالقاری نے کہا کہ میں عمر بن خطاب ؓ کے عہد میں بیت المال پر متعین تھا۔ ابن حجر نے الفتح میں عبداللہ ابن مسعود ؓ کے فضائل ومناقب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عبداللہ بن مسعود ؓ عمر ؓ اور عثمان ؓ کے عہد کے دوران کوفہ میں بیت المال کی ذمہ داری پر مامور تھے۔ اسی طرح جھشیاری اپنی تصنیف "**الوزراء والكُتّاب**" میں لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن ارقم بن عبد یغوث رسول اللہ ﷺ کے ایک کاتب تھے جنھیں بیت المال کی ذمہ داری بھی دی گئی تھی۔ حاکم اپنی مستدرک میں زبیر ابن بکار سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن ارقم بن عبد یغوث عمر بن خطاب ؓ کے عہد میں بیت المال پر متعین تھے اور عثمان ؓ کے عہد میں بھی اپنی وفات تک وہ اس کام پر متعین رہے، جن سے اُن کی دوستی تھی۔ حافظ ابن عبد البر اپنی تصنیف **الإستيعاب** میں لکھتے ہیں کہ زید بن ثابت ؓ عثمان ؓ کے عہد میں بیت المال پر متعین تھے، زید ابن ثابت ؓ کے ایک غلام تھے جن کا نام وہیب تھا، عثمان ؓ نے مناسب سمجھا کہ اُنھیں بھی بیت المال کی خدمت کیلئے رکھ لیا جائے۔ چنانچہ زید بن ثابت ؓ سے پوچھا کہ یہ کون ہیں، انھوں نے

بتایا کہ یہ اُن کے غلام ہیں، تو عثمان ؓ نے کہا کہ میں کچھ مسلمانوں کو اس کام پر مقرر کرنا چاہتا ہوں اور اسے بھی حق ہے لہٰذا میں اس کی تنخواہ مقرر کر دیتا ہوں اور اُس کی دو ہزار تنخواہ مقرر کی، زید ؓ نے کہا کہ اس غلام کیلئے دو ہزار نہ کیجئے، چنانچہ عثمان ؓ نے ایک ہزار مقرر کر دی۔ صدفی اپنی ایک تصنیف علمائے مصر اور صحابہ کرام میں لکھتے ہیں کہ ابو رافع علی ؓ کے پاس پہنچے اور اُنھوں نے رافع ؓ کو کوفہ کے بیت المال کی ذمہ داری پر مامور کر دیا۔ ابن عبد البر **الإستيعاب** میں لکھتے ہیں کہ عبید اللہ بن ابی رافع علی ؓ کے عہد میں خازن اور کاتب تھے۔ عینی نے **عمدة القاري** میں لکھا ہے کہ عبداللہ ابن وہب السوائی سے علی ؓ بہت انس رکھتے تھے اور اُن کا احترام اور اُن پر اعتماد کرتے تھے، لہٰذا اُنھیں کوفہ کے بیت المال کی ذمہ داری سونپ دی تھی۔ علی ؓ نے زیاد ؓ کو بصرہ کے بیت المال پر متعین کیا تھا، جھشیاری لکھتے ہیں کہ جب وہ بصرہ پہنچے تو اُنھیں خراج اور دیوان کی ذمہ داری بھی دی گئی۔

بیت المال کو دو حصوں پر منقسم کیا جا سکتا ہے:

ریونیو کا دیوان: جو مزید تین دیوانوں پر تقسیم ہوگا:

- فئے اور خراج کا دیوان: جس میں مویشی، خراج، زمینیں، جزیہ، فئے اور ٹیکس شامل ہیں۔
- ملکیات عامہ کا دیوان: جس میں تیل، گیس، برقی توانائی، بجلی، معدنیات، سمندر، ندیاں، جھیلیں، چشمہ، جنگلات، چراگاہیں (Pastures) اور حمٰی شامل ہیں۔
- صدقات کا دیوان؛ اس میں پیسے کی زکوٰۃ، تجارت، زراعت اور پھل، اونٹ، گائے، اور بکریاں شامل ہیں۔

مصارف کا دیوان: جو آٹھ دیوان پر مشتمل ہوگا:

- دار الخلافہ کا دیوان
- ریاستی سروسز کا دیوان

- گرانٹس کا دیوان
- جہاد کا دیوان
- صدقات کے مصارف کا دیوان
- ملکیتِ عامہ کے مصارف کا دیوان
- ہنگامی صورتِ حال کا دیوان
- میزانیہ عامہ (General Budget)، محاسبہ عامہ (General Accounts) اور مراقبہ عامہ (General Monitoring) کا دیوان۔

بارھواں:

شعبۂ ابلاغ

ریاست اور دعوت، دونوں پہلوؤں سے ذرائع ابلاغ کی افادیت نہایت اہم ہے، یہ محض عوامی بہبود کے انتظامی اداروں کی طرح ایک ادارہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک مستقل شعبہ کی حیثیت سے براہِ راست خلیفہ کے ماتحت ہوگا اور اس کی حیثیت ریاستی ڈھانچوں میں سے ایک ڈھانچے کی ہوگی۔

اسلام کو مضبوط اور مؤثر طور پر پیش کرنے کیلئے ذرائع ابلاغ کے متعلق ایک جامع پالیسی ضروری ہے، تاکہ لوگ اسلام کی جانب مائل ہوں، اسے سمجھیں، اس پر غور وفکر کریں اور پھر اسے قبول کریں۔ نیز اسی سے بقیہ مسلم ممالک کا ریاستِ خلافت میں ضم ہونا ممکن ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ کئی امورِ ابلاغ ایسے ہوتے ہیں جن کا ریاست سے گہرا تعلق ہوتا ہے اور اُنہیں عام کرنے کیلئے خلیفہ کا حکم ہونا ضروری ہوتا ہے، مثلاً عسکری امور اور اس سے متعلق دیگر معاملات جیسے فوج کی نقل و حرکت، جنگ میں فتح یا شکست کی خبر اور فوجی صنعت کے امور جن کی تشہیر یا اُن کا صیغۂ راز میں رکھنا خلیفہ کی صوابدید پر ہوتا ہے۔

اس کی دلیل کتاب وسنت میں وارد ہے، چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ﴾

''جہاں انھیں کوئی خبر امن کی یا خوف کی ملی تو انہوں نے اسے مشہور کرنا شروع کر دیا، حالانکہ اگر یہ لوگ اسے رسول کے اور اپنے میں سے اہلِ اقتدار کے حوالے کر دیتے، تو وہ جو اُن میں تحقیق کرنے والے ہیں، اس کی تحقیق کر لیتے'' (النساء: 83)

سنت میں اس کی دلیل ابن عباس ﷺ سے مروی یہ حدیث ہے جسے حاکم نے مستدرک میں نقل کیا ہے اور مسلم کی شرط پر صحیح بتایا ہے جس سے علامہ ذہبی نے اتفاق کیا ہے، اس میں آتا ہے:

(وقد عميت الأخبار على قريش، فلا يأتيهم خبر رسول الله ﷺ ولا يدرون ما هو صانع)

''قریش سے خبروں کو چھپایا گیا، چنانچہ اُنھیں رسول اللہ ﷺ کی خبر ہی نہیں ملتی تھی، اور آپ ﷺ جو کچھ تیاری کر رہے تھے، قریش اس کا کچھ بھی نہ کر سکے''

اسی طرح ابن ابی شیبہ نے ابی سلمہؓ سے روایت نقل کی ہے: پھر نبی کریم ﷺ نے (فتح مکہ کے لیے روانگی سے قبل) عائشہؓ سے فرمایا کہ وہ آپ ﷺ کے جانے کا سامان تیار کر دیں اور کسی کو اس کی اطلاع نہ دیں۔ پھر مخبروں کے ذریعہ خبریں اہل مکہ تک نہ پہنچنے کی دعا فرمائی۔

صحیحین میں کعب بن مالک ﷺ سے غزوہ تبوک کے بارے روایت نقل کی گئی ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ غزوہ تبوک سے قبل آپ ﷺ نے کسی بھی غزوہ کے وقت اپنا ارادہ ظاہر نہ کیا تھا، یہ غزوہ تبوک نہایت شدید گرمی میں ہوا تھا جس میں دور کا سفر تھا اور دشمن کی تعداد کثیر تھی لہٰذا آپ ﷺ نے مسلمانوں پر سب ظاہر کر دیا تا کہ وہ اسی مناسبت سے اپنی تیاری کر لیں۔ اسی طرح بخاری میں انس ﷺ سے روایت نقل کی گئی ہے کہ آپ ﷺ نے لوگوں تک خبر پہنچنے سے پہلے زید، جعفر اور ابن رواحہ ﷺ کی شہادت کی اطلاع سنائی اور فرمایا:

((أخذ الراية زيد فأصيب، ثم أخذها جعفر فأصيب، ثم أخذها ابن رواحة فأصيب، وعيناه تذرفان حتى أخذها سيفٌ من سيوف الله حتى فتح الله عليهم))

''زید نے پرچم لیا اور وہ شہید ہو گئے، پھر جعفر نے پرچم اُٹھایا اور وہ بھی شہید ہو گئے، پھر ابن رواحہ نے پرچم اُٹھایا اور وہ بھی شہید ہو گئے، آپ ﷺ یہ فرماتے تھے اور آپ ﷺ کی چشمِ مبارک سے آنسو

رواں تھے۔ پھر پرچم کو اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے اُٹھایا یہاں تک کہ اللہ نے مسلمانوں کو فتح سے ہمکنار فرمایا''

اسی حکم پر خلفائے راشدین بھی کاربند رہے، ابن مبارک نے **الجہاد** میں اور حاکم نے **مستدرک** میں زید ابن اسلم سے اور انھوں نے اپنے والد اور پھر عمر بن خطاب ؓ سے نقل کیا ہے، جس کے بارے میں حاکم کہتے ہیں کہ یہ روایت مسلم کی شرائط پر صحیح ہے اور علامہ ذہبی نے اس سے اتفاق کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عمر بن خطاب ؓ کو اطلاع ہوئی کہ ابوعبیدہ ؓ ملکِ شام میں محصور ہو گئے ہیں اور وہاں کے تمام لوگ اُن کے خلاف اکھٹے ہو گئے ہیں تو عمر ؓ نے اُنھیں خط لکھا: السّلام علیکم، امابعد، کسی مومن پر ایسی کوئی شدّت نہیں آتی جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کشادگی نہ رکھی ہو، اور ایسی کوئی عسرت نہیں جس کے بعد اس سے بڑھ کر سہولت نہ ہو۔ اس کے بعد قرآنِ کریم کی یہ آیت تحریر کی:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْاقف وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! صبر سے کام لو، اور مقابلہ میں ثابت قدم رہو؛ اور آپس میں جڑے اور مقابلے میں ڈٹے رہو؛ اور اللہ سے ڈرتے رہو؛ تاکہ تم کامیاب ہوسکو'' (ال عمران:200)

راوی کہتے ہیں کہ اس کے جواب میں ابوعبیدہ ؓ نے لکھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّ زِیْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ﴾

''جان رکھو دنیا کی زندگی تو بس ایک کھیل اور تماشہ ہے، اور ایک زینت اور تمہارا آپس میں ایک دوسرے پر فخر جتانا اور مال اور اولاد میں اپنے آپ کو دوسرے سے بڑھا ہوا ظاہر کرنا'' (الحدید:20)

عمر ؓ یہ مراسلہ لے کر باہر نکلے اور منبر پر جا کر بیٹھے، پھر لوگوں کو پڑھ کر سنایا اور کہا، اے اہلِ مدینہ، ابوعبیدہ تم لوگوں کو جہاد میں نکل کھڑے ہونے کیلئے راغب کر رہے ہیں۔

عسکری خبروں میں گفت وشنید، وعدے اور مذکرات بھی شامل ہوتے ہیں جو خلیفہ یا اس

کے نائب اور کفر ممالک کے نمائندوں کے مابین ہوں۔ اس کی مثال سیرتِ رسول میں رسول اللہ ﷺ اور قریش کے نمائندوں کے درمیان حدیبیہ کے موقع پر جو گفتگو ہوئی، سے ملتی ہے جس کے بعد صلح طے ہوئی، نیز رسول اللہ ﷺ اور نجران کے وفد کے درمیان جو مناظرہ ہوا یا رسول اللہ ﷺ کے حکم پر ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ اور حسان رضی اللہ عنہ کا تمیم کے وفد سے مناظرہ ہوا، وغیرہ۔ یہ تمام سرِ عام ہوئے تھے اور اِن میں کچھ بھی صیغۂ راز میں نہیں تھا۔

خبروں کی اس قسم کے علاوہ ایسی بھی خبریں ہوتی ہیں جن کا ریاست سے براہِ راست تعلق نہیں ہوتا اور اُن کے شائع کئے جانے میں خلیفہ کی رائے براہِ راست اثر انداز نہیں ہوتی، مثلاً روزمرہ کی خبریں، سیاسی حکمتِ عملی، ثقافتی اور سائنسی خبریں یا عالمی واقعات؛ لیکن بہرحال اِن کے بعض پہلو زندگی کے بارے میں مخصوص نظریہ سے وابستہ ہوتے ہیں یا عالمی تعلقات کے بارے میں ریاستی نقطۂ نظر سے منسلک ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایسی خبروں پر ریاست کے کنٹرول کی نوعیت پہلے صیغہ کی خبروں سے مختلف ہوتی ہے۔

خبروں کی ایسی تقسیم کے پیشِ نظر ضروری ہو جاتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کا شعبہ اِن دو محکموں پر مشتمل ہو:

- ایک وہ محکمہ جو اُن خبروں سے متعلق ہو جن کا ریاست سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے، جیسے عسکری امور، عسکری صنعت، عالمی تعلقات وغیرہ۔

پس شعبہ ابلاغ کی اِن خبروں پر براہِ راست نگرانی یا کنٹرول ہوگا، اور ایسی کسی بھی خبر کو ریاستی یا نجی ذرائع ابلاغ (میڈیا) میں شائع کئے جانے سے پہلے اس محکمہ کو پیش کیا جائے گا۔

- دوسرا وہ محکمہ جو خبروں کی دوسری قسم سے متعلق ہوتا ہے اور اس محکمہ کا اُن خبروں پر براہِ راست کنٹرول نہیں ہوتا۔ ایسی خبروں کے شائع کرنے کیلئے ریاستی یا نجی ذرائع ابلاغ کو اس محکمے سے قبل از اشاعت اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔

ذرائع ابلاغ کیلئے اجازت نامہ یا لائسنس:

ریاستِ خلافت میں ذرائع ابلاغ کیلئے کسی قسم کے لائسنس کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ ہر وہ شخص جو ریاست کی شہریت رکھتا ہو وہ کسی بھی نوعیت کے ذرائع ابلاغ چلا سکتا ہے، یعنی طباعتی رسالہ (Print Media)، صوتی (Radio etc.)، یا ناظراتی (Visual)۔ کسی بھی شہری کو اپنا ذریعۂ ابلاغ شروع کرنے کیلئے محض محکمۂ ابلاغ کو اطلاع کر دینا ہی کافی ہوتا ہے کہ وہ کس نوعیت کا ادارہ قائم کرنے جا رہا ہے۔

اب یہ ادارہ، ایسی خبریں شائع کرنے کیلئے جو اوپر پہلی قسم میں بیان کی گئیں، متعلقہ محکمے سے اجازت حاصل کرنے کا پابند ہوگا، تاہم اس کے علاوہ خبروں کی اشاعت کیلئے کسی قسم کی اجازت درکار نہیں ہوگی۔

بہر حال تمام حالات میں ادارے کا مالک ہی اپنے ذریعۂ ابلاغ سے کسی بھی مواد کی اشاعت کا ذمہ دار ہوگا اور کسی بھی شرعی خلاف ورزی پر اُس کا دیگر شہریوں کی طرح محاسبہ یا مؤاخذہ کیا جائے گا۔

ریاست کی میڈیا پالیسی:

ریاست کی میڈیا پالیسی کا خاکہ ایک قانون کی شکل میں صادر کیا جائے گا جو احکامِ شریعت کے موافق ہوگا۔ اس قانون کے بموجب اسلامی ریاست مسلمانوں اور اسلام کے مفاد کے مطابق گامزن ہوگی تاکہ ایک ایسے معاشرے کی بنیاد پڑے جو قوی ہو، اللہ تعالیٰ کی رسّی کو تھامے ہوئے ہو، اس معاشرے میں خیر ہو نیز وہ خیر کا باعث ہو اور فاسد افکار سے پاک ہو اور اس میں گمراہ ثقافتوں کی آلودگی نہ ہو۔ ایسا اسلامی معاشرہ جو خباثت کو رد کرے، اس میں بھلائی کی چمک ہو اور وہ معاشرہ اللہ وحدہٗ لاشریک کی پاکیزگی بیان کرتا ہو۔

تیرھواں:

مجلسِ اُمت: شوریٰ ومحاسبہ

مجلسِ اُمت مسلمانوں کی رائے کی نمائندگی کرنے والے اشخاص کی مجلس ہوتی ہے جن سے خلیفہ معاملات میں مشاورت کرتا ہے۔ نیز مجلسِ امت میں نمائندگان امت کے نائب کی حیثیت سے حکام کا محاسبہ کرتے ہیں۔ یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ماخوذ ہے جو لوگوں کی نمائندگی کرنے والے مہاجرین وانصار سے مشورہ فرماتے تھے، نیز آپ ﷺ نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کو مشاورت کیلئے مخصوص کر رکھا تھا جن سے آپ ﷺ مشورے کیلئے دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی بہ نسبت زیادہ رجوع فرمایا کرتے تھے۔ اِن اصحابِ رسول میں ابو بکر، عمر، علی، حمزہ، سلمان فارسی، حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہم وغیرہ شامل تھے۔

نیز مجلسِ امت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے بھی ماخوذ ہے جو کسی معاملہ میں مشورے کے لیے مہاجرین وانصار کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اہل شوریٰ کے لوگ علماء اور اہلِ فتاویٰ ہوا کرتے تھے۔ طبقات ابنِ سعد میں القاسم سے روایت منقول ہے کہ: ''جب ابو بکر رضی اللہ عنہ کو کوئی ایسا امر پیش آتا جس میں وہ اہل فقہ اور اہلِ رائے سے مشورہ کرنا چاہتے تو مہاجرین اور انصار کو بلاتے جن میں عمر، عثمان، علی، عبدالرحمٰن بن عوف، معاذ بن جبل، ابی ابن کعب، زید بن ثابت رضی اللہ عنہم تھے۔'' ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں یہ تمام صحابہ فتویٰ دیا کرتے تھے اور لوگ فتاویٰ کیلئے اِن ہی کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ کا یہی طرزِ عمل رہا اور آپ کے بعد جب عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو وہ بھی اِن ہی حضرات سے رجوع کیا کرتے۔ اسی طرح وہ دلائل بھی وارد ہوئے ہیں جن

میں مسلمانوں کو حکام کے محاسبہ کیلئے کہا گیا ہے۔ خلفائے راشدین کے عہد میں مسلمان اس محاسبہ پر کاربند رہے۔ جس طرح امت پر شوریٰ کیلئے اپنے نائب مقرر کرنا ضروری ہے اسی طرح محاسبہ کیلئے نائب مقرر کرنا بھی ناگزیر ہے۔ یہ تمام دلائل ایک مخصوص مجلس وضع کرنے کی اباحت پر دلالت کرکرتے ہیں، جو حکام کے محاسبہ اور شوریٰ، جو کہ قرآن وسنت کی نصوص سے ثابت ہے ،میں امت کی نیابت کرے۔ اسے مجلسِ امت اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ یہ شوریٰ اور محاسبہ میں امت کی نیابت کرتی ہے۔

اس مجلس میں ریاست کے غیر مسلم شہریوں کے نمائندہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو حکام کے مظالم کی شکایات پہنچائیں یا اسلام کے اُن پر نافذ ہونے میں کسی غلطی کی نشاندہی کریں یا جو سہولیات اُنھیں نہ پہنچ پائیں اُن کی شکایت کریں، وغیرہ۔

شوریٰ کا حق:

تمام مسلمانوں کا یہ حق ہے کہ اُن کی رائے خلیفہ تک پہنچے۔ مسلمانوں کا یہ حق ہے کہ خلیفہ مختلف امور میں اُن سے رجوع کرے اور ان سے مشورہ کرے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾

''اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے، تو اللہ پر بھروسہ کرو'' (ال عمران :159)

اور فرمایا:

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾

''اُن کا معاملہ آپس کے مشورے سے ہوتا ہے'' (شوریٰ:38)

رسول اللہ ﷺ مشورے کیلئے لوگوں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے، چنانچہ آپ نے غزوۂ بدر کے وقت اُن سے جنگ کے وقوعہ کے بارے میں مشورہ فرمایا، غزوۂ احد کے وقت لوگوں

سے رائے لی کہ آیا جنگ مدینہ ہی میں کی جائے یا مدینہ سے باہر نکلا جائے، پھر بدر کے موقع پر حباب ابن منذر رضی اللہ عنہ کی رائے اختیار کی جو ایک ماہر کی فنّی رائے تھی، جبکہ اُحد کے وقت اکثریت کی رائے اختیار کی باوجود اس کے کہ خود آپ ﷺ کی رائے اس کے برخلاف تھی۔

عمر رضی اللہ عنہ نے عراق کی فتح کے بعد وہاں کی زمین کے سلسلے میں لوگوں سے مشورہ کیا کہ کیا اُس زمین کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے یا اسے بیت المال کی ملکیت بنا کر اہلِ عراق ہی کے پاس رہنے دیا جائے اور وہ اُس زمین کا خراج ادا کرتے رہیں۔ پھر عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد ہی کے مطابق عمل کیا اور زمین اُنہی لوگوں کے پاس خراج کے عوض رہنے دی۔ اس پر اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عمر رضی اللہ عنہ سے اتفاق کیا۔

فریضہ محاسبہ:

جس طرح مسلمانوں کا یہ حق ہے کہ خلیفہ اُن سے مشورہ کرے اسی طرح اُن پر یہ لازم ہے کہ وہ حکام کے افعال وتصرفات پر اُن کا محاسبہ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر یہ فرض قرار دیا ہے کہ وہ حکام کا محاسبہ کریں اور اللہ کا یہ حکم حتمی ہے کہ حکام کا محاسبہ کیا جائے اور اگر وہ رعایا کے حقوق غصب کریں یا رعایا سے متعلق اپنے فرائض میں کوتاہی کے مرتکب ہوں یا عوام کے معاملات سے غفلت برتیں، یا اسلامی احکامات کی خلاف ورزی کریں یا اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے علاوہ اور قوانین کے ذریعے حکمرانی کریں تو اُنھیں بدل دیا جائے۔ مسلم میں امّ سلمہؓ سے روایت منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((ستكون أمراء فتعرفون وتنكرون، فمن عرف برئ، ومن أنكر سلم، ولكن من رضي وتابع، قالوا أفلا نقاتلهم؟ قال: لا، ما صلّوا...))

''ایسے امراء ہوں گے جن کے بعض کاموں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر، سو جو پہچان جائیگا وہ گناہ سے بری ہوا اور جس نے (وہ برائی) ماننے سے انکار کیا وہ محفوظ ہو گیا، لیکن جو اُن کاموں سے راضی ہو گیا اور اطاعت کی (وہ نہ بری ہوا اور نہ ہی محفوظ رہا)۔ صحابہ نے عرض کیا کہ کیا ہم اُن

سے نہ لڑیں؟ فرمایا نہیں، جب تک کہ وہ صلوٰۃ پر قائم رہیں...''

یہاں صلوٰۃ کا لفظ اسلام کے مطابق حکمرانی کرنے کیلئے کنایہ کے طور پر آیا ہے۔

صحیحین میں ابو ہریرہ ﷺ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی اور ابو بکر ﷺ خلیفہ بنے اور بعض بدوؤں نے کفر کیا تو عمر ﷺ نے کہا: ''آپ اُن سے کیسے لڑ سکتے ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا لا إله إلا اللّٰه، فمن قالها فقد عصم منى ماله و نفسه الا بحقه، و حسابه على اللّٰه))

''مجھے حکم ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑوں جب تک کہ وہ اس بات کی شہادت نہ دے دیں کہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں ہے، تو جس نے ایسا کہا اس نے اپنے مال اور خون کو مجھ سے بچالیا، سوائے اس کے حق کے، اور اُن کا حساب اللہ پر ہوگا''

اس پر ابو بکر ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم میں اُس شخص سے ضرور قتال کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے، کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، اللہ کی قسم اگر اُن لوگوں نے اونٹ کی ایک نکیل دینے سے بھی انکار کیا جو وہ رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے تو میں اُن کے اس انکار پر اُن سے قتال کروں گا۔ اس پر عمر ﷺ نے کہا: ''بخدا اللہ تعالیٰ نے ابو بکر کے سینے کو کھول دیا ہے اور میں پہچان گیا کہ یہی حق ہے''۔

اسی طرح زبیر ﷺ اور بلال بن رباح ﷺ نے عراق کی زمین کو فوج میں تقسیم نہ کرنے پر عمر ﷺ کی مخالفت کی۔ اسی طرح ایک اعرابی نے کچھ زمین کی تحویل پر عمر ﷺ کی مخالفت کی۔ ابو عبید اپنی تصنیف ''الأموال'' میں عامر بن عبداللہ بن زبیر سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی عمر ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ اے امیر المؤمنین! ہم نے ایامِ جاہلیت میں اپنے علاقے کیلئے قتال کیا اور ہم اس علاقے پر ہی تھے جب ہم نے اسلام قبول کیا، اب ہم پر غصہ کیا جاتا ہے؟ عمر نے سر جھکایا اور منہ میں ہوا بھر کر پھونک مارنے لگے اور اپنی مونچھوں کو مروڑنے لگے۔

جب وہ کسی بات پر فکرمند ہوتے تھے تو ایسے کیا کرتے تھے۔ جب اعرابی نے یہ دیکھا تو وہ اپنی بات پر متردد ہوا۔ عمر ؓ نے فرمایا: ''یہ مال اللہ کا ہے اور تمام لوگ اُس کے بندے ہیں، بخدا اگر اللہ کی راہ میں جہاد کی ذمہ داری کا بوجھ نہ ہوتا تو میں اس زمین کی ایک بالشت کو بھی تحویل میں نہ لیتا''۔ عمر ؓ نے بعض ملکیتِ عامہ کی زمینیں مسلمانوں کے گھوڑوں کیلئے مخصوص کردی تھیں۔ اسی طرح ایک خاتون نے عمر ؓ کے اس فیصلہ کی مخالفت کی کہ لوگ عورتوں کا مہر چار سو درہم سے زیادہ نہ رکھیں، چنانچہ خاتون نے عمر ؓ سے کہا کہ اے عمر تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا، کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نہیں سنا؟:

﴿وَّ اٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰىهُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡهُ شَیۡـًٔا﴾

''تو خواہ تم نے ان میں کسی کو ڈھیروں مال دے دیا ہو، اس میں سے کچھ مت لینا'' (النساء:20)

لہٰذا عمر ؓ نے فرمایا: ''عورت نے صحیح کہا اور عمر نے غلطی کی۔''

نیز علی ؓ نے عثمان ؓ کے عہدِ خلافت میں اُس بات میں اُن کی مخالفت کی جو عثمان ؓ نے حج اور عمرے کو ایک ہی سفر میں کرنے کے متعلق کہی تھی۔ مسند احمد میں عبداللہ بن زبیر ؓ سے صحیح اسناد سے روایت منقول ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم جحفہ میں عثمان ؓ کے ہمراہ تھے اور ہمارے ساتھ شام کے لوگوں کا گروہ تھا جس میں حبیب بن مسلمہ الفہری بھی تھے۔ عثمان ؓ سے ایک ہی سفر میں حج وعمرہ کرنے کے متعلق پوچھا گیا تو اُنھوں نے کہا: ''حج اور عمرہ کی بہتر تکمیل کیلئے یہ مناسب ہے کہ اِن دونوں کو حج ہی کے مہینہ میں نہ کرو، اگر تم اس عمرہ کو دوبارہ اگلے سفر میں آ کر ادا کرو تو یہ افضل ہے، اس سے اللہ تعالیٰ تمہیں بھلائیوں میں برکت دے گا۔'' اس وقت علی ؓ اپنے اونٹ کو وادی کے دامن میں چَرا رہے تھے۔ راوی کہتے ہیں کہ جس شخص نے عثمان ؓ سے بات کی تھی، اُس نے یہ بات علی ؓ کو بتائی، یہ سن کر علی ؓ عثمان ؓ کے پاس پہنچے اور کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی سنت جو اُنھوں نے قائم کی اُس پر چلوں اور اللہ تعالیٰ نے جو رخصتیں اپنے بندوں کو اپنی کتاب میں دی ہیں اُن سے مستفید رہوں۔ آپ اُن پر تنگی کر رہے ہیں اور اُنھیں اس چھوٹ سے روک رہے ہیں حالانکہ یہ ہر اُس شخص کیلئے ہے جس کو اس چھوٹ کی ضرورت

ہواور جواس دار (یعنی بیت اللہ) کی نیت کرے۔ عثمانؓ نے اسے تسلیم کرلیا اور لوگوں سے کہا :''کیا میں نے تمہیں ایسا کرنے سے روکا تھا؟ نہیں میں نے روکا نہیں تھا، البتہ یہ میری رائے تھی جس کا میں نے اشارہ کیا، اب جو چاہے اسے اختیار کرے اور جو چاہے اسے ترک کردے''۔

چنانچہ مجلس امت کو مشورہ دینے کا حق ہے اور اس پر فرض ہے کہ وہ حکام کا محاسبہ کرے۔

شوریٰ اور محاسبہ میں فرق ہوتا ہے، شوریٰ کسی معاملہ میں فیصلہ کرنے سے قبل مشورہ طلب کرنا یا کسی رائے کا سننا ہے جبکہ محاسبہ فیصلہ کیے جانے یا اُس پر عمل ہو جانے کے بعد تنقید یا اعتراض کرنا ہے۔

مجلس امت کے ممبران کا انتخاب:

مجلس امت کے ممبران بذریعہ انتخاب مجلس کے ممبر بنتے ہیں، اُن کا تقرر نہیں کیا جاتا، کیونکہ وہ عوام کی رائے کی نمائندگی کرتے ہیں اور ایک مؤکل ہی اپنے وکیل یا نمائندہ کو منتخب کرتا ہے، اور ایسا مطلقاً نہیں ہوتا کہ وکیل یا نمائندہ کسی پر تھوپ دیا جائے۔ مجلس امت کے ارکان امت اور جماعتوں یا گروہوں کی نمائندگی کرتے ہیں، اور جماعتوں یا غیر معروف اشخاص کی رائے معلوم نہیں کی جاسکتی تاوقتیکہ وہ افراد و جماعتیں اُنہیں منتخب نہ کریں۔ رسول اللہ ﷺ جن لوگوں سے مشورہ لینے کیلئے رجوع فرماتے تھے، اُنہیں اُن لوگوں کی ذاتی اہلیت، مہارت یا شخصیت کے سبب نہیں چنا تھا بلکہ ایسے لوگوں کو منتخب کرنے کیلئے دو پیمانے اختیار فرمائے تھے: اوّل یہ کہ وہ افراد اپنے اپنے قبائل یا جماعت کے سردار تھے، قطع نظر اس سے کہ اُن کی ذاتی صلاحیتوں یا مہارتوں کے۔ دوم یہ کہ یہ لوگ مہاجرین وانصار کی نمائندگی کرتے تھے۔ لہٰذا یہ واضح ہوا کہ وہ غرض جس کے سبب شوریٰ کا وجود ہے، وہ عوام کی نمائندگی ہے، اور یہی بات قبائل کے سرداروں کو شوریٰ کیلئے خاص کرنے کا سبب تھی، اور یہی سبب تھا کہ مہاجرین اور انصار کے نمائندے اس کام کیلئے مخصوص کئے گئے تھے۔ تاہم غیر معروف افراد کی نمائندگی اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ اپنے

نمائندوں کا انتخاب نہ کریں۔ لہٰذا مجلسِ امت کے ارکان کا انتخاب ہونا ضروری ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شوریٰ کے لوگوں کو خود چنا تھا، تو وہ علاقہ جہاں مہاجرین و انصار مقیم تھے، یعنی مدینہ، تو وہ ایک چھوٹی سی جگہ تھی اور یہ کہ آپ ﷺ تمام مسلمانوں سے بذاتِ خود واقف تھے۔ اس کے برعکس بیعتِ عقبہ ثانیہ کے وقت رسول اللہ ﷺ تمام بیعت دینے والوں سے واقف نہیں تھے چنانچہ آپ ﷺ نے سرداروں کے انتخاب کا معاملہ لوگوں پر چھوڑ دیا اور لوگوں سے فرمایا:

((أخرجوا إليَّ منكم اثنى عشر نقيباً يكونوا على قومهم))

''اپنے میں سے بارہ سردار منتخب کرو جو اپنی قوم (کے معاملے) کے ذمہ دار ہوں''

اس حدیث کو سیرت ابنِ ہشام میں کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے۔

لہٰذا مجلسِ امت کے اراکین کا رائے پیش کرنے میں امت کا وکیل ہونے، نیز مجلس امت کے وجود کی علت کہ وہ شوریٰ و محاسبہ میں امت کی نمائندگی کرتی ہے، اور یہ علت مجلس امت میں اسی وقت پوری ہوتی ہے جب اس کے اراکین کا انتخاب ہو یعنی انہیں معلوم کیا جائے؛ اس تمام سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ مجلسِ امت کے اراکین منتخب کردہ ہوں نہ کہ اُن کا تقرر کیا جائے۔

مجلسِ امت کے انتخاب کی کیفیت:

1) والیوں کے متعلق بحث کے دوران اس تبنی کا ذکر ہو چکا ہے کہ ولایہ کے عوام کی نمائندگی کیلئے ایک مجلس ہوگی۔ اس سے دو اغراض مقصود ہیں: اول یہ کہ والی تک ولایہ کی واقعی صورتِ حال اور ولایہ کی ضروریات سے متعلق معلومات بہم پہنچائی جائیں تاکہ والی کو ولایت کے عوام کی زندگی بہتر اور پرسکون بنانے کیلئے اقدام کرنا آسان ہو اور والی کو اُنھیں ضروریات بہم پہنچانے میں مدد ملے؛ دوم یہ کہ عوام حکمرانی سے متعلق والی کو اپنی رضامندی یا شکایتیں پہنچا سکیں کیونکہ مجلسِ ولایہ کی اکثریت اگر والی کے خلاف شکایت کرے تو والی کو برطرف کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ یعنی مجلسِ ولایہ

کی حقیقت یہ ہے کہ وہ والی کی معاونت کی مجلس ہے جس سے والی کو ولایہ کی واقعی صورتِ حال کا علم ہوتا ہے اور وہ ولایہ کے لوگوں کی شکایتوں اور رضا مندی کو جانتا ہے تا کہ اُس کے کام میں بہتری آئے۔ اس کے سوا مجلسِ ولایہ کے اختیارات مجلسِ اُمت کی طرح نہیں ہوتے، یہ بحث آئندہ صفحات پر آئے گی۔

2) ہم یہاں یہ تبنی کرتے ہیں کہ مجلس شوریٰ (رائے ومحاسبہ) کیلئے یہ لازمی ہے کہ وہ منتخب ہو اور امت کی نمائندگی کرے اور اُس کے مخصوص اختیارات ہوں۔ اِن اختیارات کی تفصیل مناسب جگہ مذکور ہے۔

3) نتیجتاً مجلس ولایات اور مجلس امت کے اراکین کے انتخاب کیلئے انتخابات ہوں گے۔

4) انتخابی کارروائی کو آسان بنانے اور عوام پر بار بار انتخابات کا بوجھ نہ ڈالنے کی غرض سے ہم یہ تبنی کرتے ہیں کہ پہلے تمام ولایات کیلئے مجلسوں کے انتخاب ہوں اور پھر اس کے بعد ان مجلسوں کے کامیاب اراکین اپنے میں مجلس اُمت کے اراکین کا انتخاب کریں، یعنی ولایات کی مجلسوں کے انتخاب براہِ راست ہوں گے اور مجلس امت کا انتخاب ولایات کی مجالس کریں گی۔ بالفاظِ دیگر مجلسِ امت کی میعاد اور ولایات کی مجالس کی میعاد یکساں ہوں گی۔

5) مجالس ولایات کا جو رکن مجلسِ امت کیلئے منتخب ہو جائے، اُس کی جگہ وہاں کے انتخاب میں اِس رکن کے بعد سب سے زیادہ ووٹ لینے والا شخص مجلس ولایہ میں اس کی جگہ رکن ہوگا اور اگر ایسے دو اشخاص ہوں جنھیں برابر ووٹ ملے تھے تو اُن کے درمیان قرعہ اندازی ہوگی۔

6) ریاست کے ذمیوں کے نمائندے بھی مجلس ولایہ میں ہوں گے اور وہ مجلسِ امت کیلئے اپنے نمائندے منتخب کریں گے۔ اِن کی میعادِ رکنیت وہی ہوگی جو اُن مجالس ولایات یا مجلسِ امت کی ہے۔

اِن بنیادوں پر قانون وضع کیا جائے گا جس کے پیشِ نظر مندرجہ بالا امور ہوں گے۔

اس میں مجالس ولایہ اور مجلس امت کے انتخاب کے طریقہ کار کو بیان کیا جائے گا۔ اس پر بحث اور تبنی مناسب وقت پر کی جائے گی۔

مجلس امت کی رکنیت:

ہر وہ شخص جو ریاست کا شہری ہو، عاقل و بالغ ہو، اُسے مجلس امت کی رکنیت کا اور اس کیلئے انتخاب کا حق ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، مسلم ہو یا غیر مسلم، کیونکہ مجلس امت کو محض رائے دینے کا اختیار ہے نہ کہ حکومت وتشریع یا قانون سازی کا۔ یہ اُس حدیث سے نہیں ٹکراتا جس میں عورت کے حاکم ہونے کو منع کیا گیا ہے بلکہ یہ شوریٰ ومحاسبہ کے ضمن میں آتا ہے جو عورتوں کا بھی اسی طرح حق ہے جس طرح مردوں کا۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس بعثت کے تیرھویں سال یعنی ہجرت کے سال 75 مسلمان آئے جن میں 73 مرد اور 2 خواتین تھیں۔ اِن سب نے مل کر بیعتِ عقبہ ثانیہ کی جو کہ جنگ وقتال اور سیاست کی بیعت تھی۔ اپنی اس بیعت سے فارغ ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اُنھیں حکم دیا:

((أخرجوا إليَّ منكم اثنى عشر نقيباً ليكونوا على قومهم))

''اپنے میں سے بارہ سردار منتخب کرو جو اپنی قوم (کے معاملے) کے ذمہ دار ہوں''

یہ ایک طویل حدیث کا حصہ ہے جسے مسند احمد میں کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا اپنے میں نمائندوں کے انتخاب کا یہ حکم سب کے لیے تھا کیونکہ آپ ﷺ نے صرف مردوں کو خاص نہیں فرمایا اور نہ ہی خواتین کو مستثنیٰ رکھا؛ نہ کسی کو منتخب کرنے کیلئے خواتین کو مستثنیٰ کیا اور نہ ہی خاتون کو خود منتخب ہونے سے مستثنیٰ فرمایا۔ اس طرح انتخاب کی یہ عمومیت قائم رہے گی کیونکہ اس کی کوئی قید یا تخصیص وارد نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ دلیل ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ نے خواتین کو اپنے نمائندے منتخب کرنے اور خود نمائندہ منتخب ہونے کا حکم دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ لوگوں سے بیعت لی، اس دوران ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ آپ

کے ساتھ تھے۔ آپ ﷺ نے مرد وخواتین دونوں سے بیعت لی۔ یہ حکومت کی بیعت تھی نہ کہ اسلام کی بیعت کیونکہ وہ عورتیں تو پہلے ہی مسلمان تھیں۔ حدیبیہ کے موقع پر بیعتِ رضوان کے بعد آپ ﷺ نے عورتوں سے بیعت لی، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ﴾

''اے نبی ﷺ، جب مومن عورتیں آپ کے پاس آ کر آپ سے اس پر بیعت کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی اور نہ چوری کریں گی، نہ زنا کریں گی، نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ اپنے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان کوئی بہتان گھڑ لائیں گی، اور نہ کسی امر معروف میں آپ کی نافرمانی کریں گی، تو اُن سے بیعت لے لو'' (ممتحنہ:12)

یہ بیعت بطورِ حاکم بیعت تھی کیونکہ خود قرآن نے یہ کہہ دیا کہ وہ عورتیں مسلمان تھیں اور ان کی بیعت اس بات پر تھی کہ وہ کسی معروف امر میں نافرمانی نہیں کریں گی۔

اس کے علاوہ خواتین کو یہ حق حاصل ہے کہ کوئی اُن کی رائے کی نمائندگی کرے کیونکہ عورت کو رائے دینے کا حق ہے، نیز خواتین کو یہ بھی حق ہے کہ وہ کسی اور کی رائے کی نمائندگی کریں کیونکہ نمائندگی کرنے کے لیے مرد ہونا شرط نہیں ہے لہٰذا وہ دوسروں کی رائے کی نمائندگی کر سکتی ہیں۔

پھر عمر رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ جب اُنھیں کوئی معاملہ پیش آتا تو وہ مسلمانوں کی رائے لیتے، خواہ یہ معاملہ احکام شریعت سے متعلق ہوتا، حکومت سے یا ریاست کا کوئی بھی معاملہ ہوتا۔ آپ رضی اللہ عنہ عورتوں اور مردوں کو مسجد بلاتے اور رائے لیتے تھے، اور مہر کے معاملہ میں آپ رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کے مخالفت کرنے پر اپنی رائے سے رجوع بھی کیا تھا۔

جس طرح مسلمانوں کو مجلسِ اُمت میں نمائندگی کا حق ہوتا ہے اسی طرح غیر مسلموں کو

بھی یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ غیر مسلموں کی نمائندگی کریں اور اپنے اوپر اسلام کے غلط نفاذ یا اپنے ساتھ ہونے والے کسی ظلم کو بیان کریں۔

البتہ غیر مسلموں کو یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ کسی شرعی حکم کے متعلق اپنی رائے کو پیش کریں، کیونکہ اسلامی شریعت اسلامی عقیدے سے ماخوذ ہوتی ہے یعنی یہ وہ شرعی احکام ہوتے ہیں جو اسلام کے ادلۂ تفصیلیہ سے مستنبط شدہ ہوتے ہیں نیز یہ انسانی مسائل کو ایک مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں جس کا تعین اسلامی عقیدہ کرتا ہے، جبکہ ایک غیر مسلم کا عقیدہ اسلامی عقیدے سے متناقص ہوتا ہے اور زندگی سے متعلق اُس کا نظریہ اسلامی نظریہ سے متناقض ہوتا ہے، لہٰذا شرعی احکامات کے متعلق اُس کی رائے نہیں لی جاسکتی۔

مزید یہ کہ کسی غیر مسلم کو خلیفہ کے انتخاب میں دخل کا کوئی حق نہیں ہوتا اور نہ ہی خلافت کے انتخاب کیلئے امیدوار طے کرنے میں غیر مسلموں کا کوئی کردار ہوتا ہے کیونکہ اُنھیں حکومت کا حق حاصل نہیں ہے۔ البتہ مجلسِ امت کے ممبر کی حیثیت سے اس کے باقی اختیارات ایک مسلم ہی کی طرح ہوتے ہیں اور اسے ہی ایک مسلمان کی طرح اپنی رائے رکھنے کا اختیار ہوتا ہے۔

مجلسِ اُمت کی رکنیت کی میعاد:

مجلسِ اُمت کی رکنیت محدود وقت کیلئے ہوتی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جن لوگوں کو رائے کیلئے مخصوص کیا تھا، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اُن پر اکتفاء نہیں کیا۔ پھر عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اُن لوگوں پر اکتفاء نہیں کیا جو ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مشورے کیلئے خاص تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ خود بھی جن لوگوں کی طرف اپنے ابتدائی دور میں رجوع کیا کرتے تھے، اپنے عہدِ خلافت کے اواخر میں ان سے مختلف لوگوں کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مجلسِ امت کی رکنیت معین مدت کیلئے ہوتی ہے۔ ہم یہاں یہ تبنی کرتے ہیں کہ یہ میعاد پانچ سال کی ہوگی۔

مجلسِ اُمت کے اختیارات:

مجلسِ امت کے اختیارات حسبِ ذیل ہوتے ہیں:

1) (الف) عملی امور میں، اور ان معاملات میں جو داخلی پالیسی کے امور کو نبٹانے سے متعلق ہوں، جن میں تحقیق و تفتیش اور گہری فکر کی ضرورت نہ ہو اور حکومت کے تعلیم، صحت، اقتصاد و تجارت، صنعت، زراعت وغیرہ سے متعلقہ امور جو عوام کی پرسکون زندگی کیلئے لازمی خدمات بہم پہنچانے سے متعلق ہوں یا اُن کی بستیوں میں حفظ و امان بہم پہنچانے یا دشمن کے خطرے کے ازالہ سے متعلق ہوں؛ تو خلیفہ ایسے معاملات میں مجلسِ امت کی پیش کردہ رائے کا پابند ہوتا ہے اور اکثریت کی رائے ہی قابلِ نفاذ ہوتی ہے۔

(ب) ایسے فکری امور جن میں گہری چھان بین اور غور و فکر درکار ہو جیسے حقائق کی تفتیش یا جنگ کا اعلان۔ یہ ایسے معاملات ہوتے ہیں جن میں مہارت، علم اور جانچ پڑتال درکار ہوتی ہے، مثلاً جنگی منصوبے تیار کرنا، فنی یا عملی معاملات۔ یہ ایسے معاملات ہیں جن میں مخصوص مہارت و تجربہ کاروں کی رائے ضروری ہوتی ہے نہ کہ اکثریت کا مشورہ۔ اسی طرح مالیاتی امور، عسکری معاملات اور خارجہ پالیسی سے متعلق امور بھی اسی ضمن میں آتے ہیں، جن کی دیکھ بھال خلیفہ احکام شریعت کے مطابق اپنی رائے اور اجتہاد سے کرتا ہے نہ کہ مجلسِ اُمت کی رائے سے۔ خلیفہ کو بہرحال یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ مجلسِ اُمت سے اِن معاملات میں مشاورت کرے لیکن پھر اپنی ہی رائے پر قائم رہے۔ نیز مجلس بھی اپنی رائے پیش کر سکتی ہے لیکن اِن معاملات میں مجلس کی رائے کا اختیار کر لیا جانا لازمی نہیں ہوتا۔

2) قانون سازی میں مجلسِ اُمت کی رائے نہیں لی جاتی، قانون سازی یا تشریع کیلئے کتاب اللہ، سنتِ نبوی، اور جس کی طرف یہ رہنمائی کرتے ہیں یعنی صحابہ کرام کا اجماع اور شرعی قیاس، ہی مرجع و مآخذ ہوتے ہیں، اور صحیح اجتہاد کے ذریعے اِن ہی سے استدلال کیا جاتا ہے، نیز قوانین وضع کرنے اور احکام شریعت کی تبنی کیلئے یہی مصادر و مآخذ بنیاد ہوتے ہیں۔ خلیفہ کو یہ اختیار ہے کہ وہ اُن احکام و قوانین کو مجلسِ امت کے روبرو پیش کرے جنہیں وہ تبنی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور

مجلس کے مسلمان اراکین اُن پر غور کریں کہ آیا اِن میں کیا صواب اور خطا ہے۔ پھر اگر وہ اس کے دلائل یا استنباط کی صحت میں اختلاف کریں کہ یہ احکام وقوانین اصولِ شرع کے طریقہ سے متعلق ریاست کی تبنی کے مخالف ہیں، تو یہ معاملہ محکمۂ مظالم کی طرف بھیجا جائے گا اور محکمۂ مظالم کی رائے لازمی ہوگی۔

3) مجلسِ امت کو یہ حق ہوگا کہ وہ ریاست میں انجام پانے والے کسی بھی عمل پر خلیفہ کا محاسبہ کرے، خواہ یہ امور داخلی ہوں، خارجی ہوں، مالیات سے متعلق ہوں یا عسکری نوعیت کے ہوں وغیرہ۔ اُن معاملات میں جہاں اکثریت کی رائے پر عمل کرنا لازم ہو، وہاں مجلس کی رائے لازم ہوگی اور جن معاملات میں اکثریت کی رائے لازم نہیں ہوتی اُن میں مجلس کی رائے بھی لازم نہیں ہوگی۔

اگر مجلس امت خلیفہ سے کسی ایسے معاملہ کی شرعی حیثیت میں اختلاف کرے جو انجام پا چکا ہے، تو اس سلسلے میں محکمۂ مظالم کی طرف رجوع کیا جائے گا تا کہ اُس کی شرعی حیثیت کا تعین ہو سکے۔ پھر محکمۂ مظالم کی رائے قابلِ التزام ہوگی۔

4) مجلسِ اُمت کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ معاونین، والیوں اور عمال کے متعلق اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرے، اس میں اکثریت کی رائے ہی قابلِ نفاذ ہوگی اور خلیفہ اُن کو فوراً معزول کرنے کا پابند ہوگا۔ اگر اس رضامندی یا شکایت میں مجلسِ اُمت کی رائے اُس مخصوص ولایہ کی مجلس کی رائے سے مختلف ہو تو مجلسِ ولایت کی رائے کو ترجیح دی جائے گی۔

5) مجلس کے مسلم اراکین کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ محکمۂ مظالم کی جانب سے جن اشخاص کو خلافت کے امیدوار کے لیے درکار شرائط کے سلسلے میں درست قرار دیا جا چکا ہے، کی شارٹ لسٹنگ کرے۔ خواہ یہ تعداد چھ ہو یا دو، جیسا کہ خلیفہ کے انتخاب کے ذیل میں آیا ہے۔ اس موضوع میں مجلس کی اکثریت کی رائے قابلِ نفاذ ہوگی اور مجلس کے ذریعہ نامزد امیدواروں کے علاوہ کسی اور کی نامزدگی قبول نہیں کی جائے گی۔

یہ مجلس امت کے اختیارات ہوئے، جن کے دلائل حسبِ ذیل ہیں۔

دفعہ نمبر 1) (الف) عملی معاملات میں اور اُن امور میں جن میں تحقیق و تفتیش لازمی نہ ہو، مجلس امت کی رائے کا قابلِ التزام ہونا رسول اللہ ﷺ کے اُس فعل سے ماخوذ ہے کہ جنگِ اُحد کے موقع پر آپ ﷺ اور کبارِ صحابہ کی رائے مدینہ کے اندر رہ کر مقابلہ کرنے کی تھی، لیکن آپ ﷺ نے اکثریت کی رائے کو قبول فرمایا اور شہر سے باہر جا کر مقابلہ کیا۔ نیز رسول اللہ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

((لو اجتمعتا فی مشورة ما خالفتکما))

''اگر تم لوگ مشورہ میں ایک رائے پر متفق ہوتے، تو میں اُس کے خلاف نہ کرتا''

لہٰذا وہ عملی امور جو رعایا کو اُن کی بہتر اور پرسکون زندگی کیلئے سہولیات فراہم کرنے سے متعلق ہوں یا حفظ وامان اور عوام کی بستیوں کو خطرات سے محفوظ رکھنے سے متعلق ہوں، اِن میں مجلس کی اکثریت کی رائے ہی قابلِ نفاذ ہوگی اور خلیفہ باوجود اپنی ناپسند کے اس رائے کا پابند ہوگا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی رائے مختلف ہونے کے باوجود مدینہ سے باہر نکل کر اُحد کے میدان میں جنگ کی، کیونکہ یہ اکثریت کی رائے تھی۔

(ب) اس موضوع میں اصل یہ ہے کہ خلیفہ رائے کیلئے علماء، مخصوص تجربہ رکھنے والے اور ماہرین کی طرف رجوع کرے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے معرکہ بدر کے وقت مناسب جگہ منتخب کرنے کیلئے حباب بن منذر رضی اللہ عنہ کی رائے لی تھی، سیرت ابنِ ہشام میں مروی ہے:

جب قافلہ، بدر کے مقام پر پانی کے نشیبی حصے پر پہنچا اور وہاں رکنے لگا تو حباب بن منذر کو یہ جگہ پسند نہ آئی اور انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ، اس جگہ پر جو قیام کیا گیا ہے، کیا یہ حکم الٰہی سے ہے کہ ہم اسے چھوڑ کر دوسری جگہ قیام نہیں کر سکتے یا یہ قیام جنگی مصلحت کی بناء پر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہاں یہ جنگی مصلحت کے خیال سے ہی ہے۔ حباب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ مقام جنگی مصلحت کے اعتبار سے درست نہیں ہے، آپ ﷺ لشکر کو حکم دیں

کہ اس پانی کے پاس جا کر قیام کریں جو کفار سے نزدیک ہے تا کہ ہم وہاں حوض تیار کر کے پانی بھر لیں اور پانی پر ہمارا تصرف ہو نہ کہ دشمن کا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہاری رائے درست ہے اور پھر لشکر کو اُدھر لے آئے جو پانی سے قریب تھی اور وہاں ایک بڑا حوض بنا کر پانی سے بھر لیا اور پانی کے برتن اُس میں ڈالنے لگے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حباب رضی اللہ عنہ کی رائے سنی اور اُسے اختیار فرمایا۔

اس واقعہ میں جنگ اور منصوبہ بندی کے متعلق رائے کے لیے لوگوں کی رائے کو کوئی حیثیت نہیں دی گئی بلکہ اس میں ایک تجربہ کار کی رائے لی گئی۔ اسی طرح فنی امور اور وہ اختصاصی معاملات، جن میں فکر اور غور وخوص درکار ہوتا ہے، میں ماہرین اور تجربہ کاروں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے نہ کہ تمام لوگوں کی رائے کی طرف، کیونکہ ان امور میں اکثریت کی رائے کا کوئی دخل نہیں، بلکہ معلومات، تجربہ اور مہارت کو ہی وقعت حاصل ہوتی ہے۔

یہی معاملہ مالیاتی امور کا بھی ہے، کیونکہ شریعت نے اموال کے محصول نیز ان کے خرچ کئے جانے کی مدیں متعین کی ہیں۔ شریعت نے یہ بھی متعین کر دیا ہے کہ ٹیکس کب وصول کئے جائیں اور اس میں افراد کی رائے کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے، نہ مال کی وصولی کے بارے میں اور نہ ہی اُن کے خرچ کئے جانے کے لحاظ سے۔ عسکری امور بھی اسی کے مثل ہیں، شریعت نے اِن امور کی تدبیر کی ذمہ داری خلیفہ کو سونپی ہے۔ نیز احکامِ جہاد بھی متعین ہیں اور شریعت کے فیصلے کے بعد افراد کی رائے کی کچھ حیثیت نہیں رہتی۔ ریاستِ اسلامی کے دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات بھی اسی ذیل میں داخل ہیں کیونکہ یہ وہ معاملات ہیں جن میں تدبر اور غور وفکر درکار ہے اور یہ معاملہ جہاد سے منسلک ہے اور مزید یہ کہ یہ جنگ، رائے اور منصوبہ بندی میں سے ہے لہٰذا اس میں لوگوں کی رائے یا ان کی اکثریت یا اقلیت کا کچھ اعتبار نہیں۔ البتہ یہ خلیفہ کا اختیار ہے کہ وہ مشورے کیلئے اسے مجلسِ امت کے سامنے پیش کرے، کیونکہ اس میں رائے حاصل کرنا ایک مباح معاملہ ہے۔ بہرحال مجلس امت کی رائے جیسا کہ ہم جنگ بدر کے واقعہ میں دیکھ چکے ہیں لازم

نہیں ہوگی، بلکہ فیصلہ کا مجاز صاحبِ اختیار ہی ہوگا۔

اس دفعہ اوّل کی دونوں صورتوں یعنی ''الف'' اور ''ب'' کے درمیان امتیاز کو مزید واضح کرنے کی غرض سے ہم یہ بیان کرتے ہیں:

مثلاً کوئی گاؤں یا قریہ جو ندی یا نہر کے پار ہونے کے سبب آمد و رفت کے لحاظ سے باقی علاقوں سے کٹا ہوا ہو اور اُس ندی پر پُل بنایا جانا ہو۔ تو اِس معاملہ میں خلیفہ مجلسِ اُمت کی اکثریت کی رائے کا پابند ہوگا۔ لیکن ایسے امور جو فنی نوعیت کے ہوں جیسے پُل بنانے کیلئے موزوں مقام یا یہ کہ پُل آیا معلق ہو یا اُس کے ستون زیرِ آب ہوں یا اُس کا نقشہ و تفاصیل کیا ہوں وغیرہ، یہ تمام امور ایسے ہیں جن میں خلیفہ مخصوص مہارت رکھنے والے ماہرین کی طرف رجوع کرے گا نہ کہ مجلس کی اکثریت کی طرف۔

اسی طرح کسی ایسے گاؤں میں سکول قائم کرنے کا معاملہ ہے، جہاں کے طلباء کو شہر کے سکولوں تک پہنچنے میں دشواری پیش آتی ہو۔ یہاں بھی خلیفہ مجلسِ امت کی اکثریت کا پابند ہوگا، تاہم سکول کیلئے ایسے موزوں مقام کا انتخاب کہ جس کی مٹی پر مدرسہ قائم کیا جا سکتا ہے اور عمارت کا بنایا جانا یا بنی ہوئی عمارت کا خریدنا یا پھر کرایہ پر لیا جانا وغیرہ، وہ امور ہیں جن میں خلیفہ ماہرین کی طرف رجوع کرے گا نہ کہ مجلس کی اکثریت کی طرف، گو کہ وہ اُن سے مشورہ طلب کر سکتا ہے لیکن بہرحال مجلس کی رائے لازم نہیں ہوگی۔

ایسا ہی معاملہ کسی ایسی بستی کا ہوگا جو دشمن کی سرحد کے نزدیک ہو، اس بستی کو دشمن کے خطرے سے محفوظ رکھنے اور اسے دشمن کیلئے تر نوالہ نہ بنانے کیلئے اس کے اطراف حصار کے قیام کے معاملے میں خلیفہ اکثریت کی رائے کا پابند ہوگا۔ لیکن اس حصار بندی کی کیا کیفیت ہو اور دشمن کے خطرے سے نمٹنے کیلئے کیا وسائل اختیار کئے جائیں اِن میں خلیفہ ماہرین اور اصحاب اختصاص (specialists) کی طرف رجوع کرے گا نہ کہ مجلس کی اکثریت کی طرف؛ وغیرہ۔

دفعہ نمبر2: قانون سازی کا مجاز صرف اللہ وحدہ' ہے، اُس کا ارشاد ہے:

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾

''حکم کسی کا نہیں ماسوائے اللہ تعالیٰ کے'' (الانعام: 57)

اور فرمایا:

﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾

''پس تمہیں تمہارے ربّ کی قسم! یہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ اُن کے درمیان جو نزاع ہو اُس میں یہ تمہیں فیصلہ کرنے والا والا نہ بنالیں، پھر تم جو فیصلہ کر دو اس پر یہ اپنے دل میں کوئی تنگی بھی نہ پائیں، اور پوری طرح تسلیم کر لیں'' (النساء: 65)

اسی طرح سورۂ توبہ کی اس آیت کی تفسیر میں:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾

''ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنالیا ہے'' (التوبۃ: 31)

ترمذی نے عدي بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث بیان کی: عدی نے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور میرے گلے میں سونے کی صلیب تھی، آپ ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ اے عدی! اِس بت کو اپنے سے الگ کر کر دو، اُس وقت آپ ﷺ سورۂ توبہ کی یہی آیت تلاوت کر رہے تھے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

((أما إنهم لم يكونوا يعبدونهم، ولكنَّهم كانوا إذا أحلوا لهم شيئاً استحلوه، و إذا حرموا عليهم شيئاً حرموه))

''گو کہ وہ لوگ (یہود و نصاریٰ) علماء و درویشوں کی باقاعدہ عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب یہ علماء و درویش کسی حرام چیز کو اُن کیلئے حلال قرار دیتے تو لوگ اسے حلال مان لیتے تھے اور جب وہ علماء و درویش کسی حلال چیز کو حرام قرار دے دیتے تو لوگ اسے اپنے لئے حرام مان لیتے تھے''

چنانچہ نہ تو مجلس کی رائے قانون سازی کا ماٰخذ ہو سکتی ہے، اور نہ ہی اُس کی اکثریت یا

اُس کا اجماع قانون سازی کا ماخذ ہوسکتا ہے۔ قانون تو بس قرآن، رسول اللہ ﷺ کی سنت اور جس طرف صحیح اجتہاد رہنمائی کرے وہی ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمانوں کی اکثریت کی رائے کو اہمیت نہیں دی بلکہ فرمایا: ''میں اللہ کا بندہ اور اُس کا رسول ہوں اور اُس کے حکم کی خلاف ورزی ہرگز نہیں کرسکتا''، کیونکہ دراصل یہ صلح اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی تھی۔ پس قانون سازی کے لیے لوگوں کی رائے کی طرف رجوع نہیں کیا جاتا۔ پس اسی بنیاد پر شرعی احکامات کی تبنی کی جائے گی اور قوانین وضع کئے جائیں گے اور انھیں اختیار کیا جائے گا اور جیسا کہ پہلے ہم بحث کر چکے ہیں کہ صرف خلیفہ کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے۔ البتہ اس سب کے باوجود، خلیفہ کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اِن قوانین کو مجلس امت کے روبرو پیش کرے اور اُن کی رائے جانے، جیسا کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ وہ احکامِ شریعت کی تبنی کرنے کیلئے مسلمانوں سے مشورہ کرتے تھے اور صحابۂ کرام نے عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل کی مخالفت نہیں کی تھی۔ عراق کی فتح کردہ زمین کو جب مسلم فوجی سپاہیوں میں تقسیم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو آپؓ نے لوگوں سے مشورہ کیا لیکن آپ اپنی رائے پر قائم رہے اور فیصلہ کیا کہ زمین کو اس کے مالکوں ہی کے پاس رہنے دیا جائے اور اُن سے اُن پر عائد جزیہ کے علاوہ معین خراج لیا جائے۔ اس طرح عمر رضی اللہ عنہ کا اور اس سے قبل ابو بکر رضی اللہ عنہ کا لوگوں سے احکامِ شریعت میں مشورے کیلئے رجوع کرنا اور تمام صحابہؓ کا اس رجوع کی مخالفت نہ کرنا، رجوع کے جواز کیلئے صحابہ کرامؓ کا اجماع ٹھہرا۔

ایسے معاملات جن میں خلیفہ اور مجلسِ امت کے درمیان قوانین کے استنباط کے صحیح ہونے یا قانون کی دلیل کے ریاست کے تبنی شدہ مآخذ کے مطابق ہونے پر اگر اختلاف ہوجائے تو قاضیٔ مظالم ہی اس بات کا مجاز ہوتا ہے کہ وہ خلیفہ کے تبنی شدہ احکام وقوانین کا مطالعہ کرے کہ کیا اِن قوانین کی دلیل شرعی ہے یا نہیں؟ اور کیا یہ دلیل اس مخصوص حقیقت پر منطبق ہوتی ہے؟ یہ قاضیٔ مظالم ہی کا اختصاص ہوتا ہے اور اس ہی کی رائے لازم ہوتی ہے۔

مجلس امت کے غیر مسلم اراکین کو ایسے احکامات میں، جنہیں خلیفہ اختیار کرنا چاہتا ہو ،کسی دخل کی گنجائش نہیں ہوتی کیونکہ وہ اسلام پر ایمان نہیں رکھتے۔ اُن کا حق یہ ہے کہ وہ حکام کی

جانب سے سرزد ہونے والے کسی ظلم کی شکایت پیش کریں نہ کہ وہ شرعی قوانین اور احکامات کے بارے میں اپنی رائے دیں۔

دفعہ نمبر 3: اس کی دلیل حدیث کی نص سے واضح ہے جو حکام کے محاسبہ سے متعلق ہے۔ احمد نے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((سيكونون عليكم أمراء يأمرونكم بما لا يفعلون، فمن صدقهم بكذبهم، وأعانهم على ظلمهم، فليس مني و لست منه، و لن يرد عليّ الحوض))

''تم پر ایسے امیر و حکام ہوں گے جو تمہیں اُن باتوں کا حکم دیں جو خود نہ کرتے ہوں گے، پھر جس نے اُن کے جھوٹ کی تصدیق کی اور اُن کے ظلم کرنے میں اُن کا مددگار بنا تو اُس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ میرا اُس سے کچھ تعلق ہے، وہ (قیامت کے دن) میرے پاس حوض کوثر پر نہیں آئے گا''

نیز احمد نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی سند سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أفضل الجهاد كلمة الحق عند سلطان جائر))

''ظالم سلطان کے سامنے حق بات کہنا افضل جہاد ہے''

اور حاکم نے جابر رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث نقل کی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((سيد الشهداء حمزة بن عبد المطلب، ورجل قام إلى إمام جائر فأمره و نهاه فقتله))

''شہداء کے سردار حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ ہیں اور وہ شخص بھی ہے جو ایک ظالم حکمران کے سامنے کھڑا ہوا اور اُسے اچھائی کا حکم دیا اور برائی سے روکا اور اسے قتل کر دیا گیا''

مسلم نے اُم سلمہؓ سے یہ روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((ستكون أمراء فتعرفون وتنكرون، فمن عرف برئ، ومن أنكر سلم، ولكن من رضي وتابع...))

''ایسے امراء ہوں گے جن (کے بعض کاموں) کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے پہچان لیا وہ بری ہوا اور جس نے انکار کیا وہ (گناہ سے) محفوظ رہا۔ لیکن جو راضی رہا اور تابعداری کی (وہ بَری ہوا نہ محفوظ رہا)...''

ان تمام نصوص سے ثابت ہوتا ہے کہ محاسبہ کسی بھی عمل کا کیا جا سکتا ہے۔ مجلسِ امت خلیفہ، معاونین، والی اور عمال سب کا کسی بھی انجام پانے والے عمل پر محاسبہ کر سکتے ہیں۔ یہ محاسبہ کسی غلطی پر بھی ہو سکتا ہے اور کسی حکمِ شرعی کی خلاف ورزی پر بھی ہو سکتا ہے، یا اس بناء پر بھی ہو سکتا ہے کہ اس عمل سے مسلمانوں کو ضرر ہوا ہو، عوام پر ظلم ہوا ہو یا رعایا کے امور کی نگہداشت میں کوتاہی ہوئی ہو۔ خلیفہ پر واجب ہو جاتا ہے کہ وہ اِس محاسبہ اور اعتراضات کے جواب دے اور اِن اعمال و تصرفات پر اپنا موقف واضح کرے اور اپنی حجت کو پیش کرے تا کہ مجلسِ امت مطمئن ہو سکے۔ اس صورت میں جب مجلسِ امت خلیفہ کے نقطۂ نظر کو یا اُس کے دلائل کو قبول نہیں کرتی، تو اگر یہ وہ معاملات ہیں جن میں اکثریت کی رائے قابلِ التزام ہے تو خلیفہ مجلس کی اس رائے کا پابند ہوگا مثلاً وہ امور جو اوپر پہلی دفعہ کے حصہ ''الف'' میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر یہ وہ امور ہیں (مثلاً وہ امور جو پہلی دفعہ کے حصہ ''ب'' میں گزرے) جن میں اکثریت کی رائے قابلِ التزام نہیں تو ان معاملات میں خلیفہ مجلس کی رائے کا پابند نہیں ہوگا۔ مثلاً سابقہ مثال کے لحاظ سے اگر محاسبہ اس بات پر کیا جا رہا ہو کہ مدرسہ کیوں نہیں ہے؟ تو اس محاسبہ پر اکثریت کی رائے کا التزام کیا جائے گا، لیکن اگر محاسبہ اس بات پر کیا جا رہا ہو کہ بننے والے مدرسہ کی شکل ایسی کیوں ہے دوسری طرح کی کیوں نہیں؟ تو یہ محاسبہ غیر ملتزم ہوگا۔

مزید یہ کہ اگر محاسبہ کرنے والے کسی معاملہ میں اُس کے شرعی ہونے کے اعتبار سے، حکام سے اختلاف کرتے ہیں تو پھر یہ معاملہ مجلسِ امت کے ذریعہ محکمۂ مظالم کی طرف بھیجا جائے جائیگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُوْلِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اُن کی جو تم میں سے صاحب اقتدار ہیں۔ پھر اگر کسی چیز میں تمہارا تنازعہ ہو جائے تو، اُسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو'' (نساء: 59)

یعنی اگر مسلمانوں اور حکام کے درمیان کوئی تنازعہ ہوتا ہے تو اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹا دو یا اُن کی طرف رجوع کرو، یعنی اُس تنازعہ میں اللہ اور اُس کے رسول کے حکم کو ثالث بنا لو، بالفاظِ دیگر اُس میں عدلیہ کی طرف رجوع کرو۔ لہٰذا یہ معاملہ محکمۂ مظالم کی طرف بھیجا جائیگا جس کی رائے قابلِ التزام ہوگی کیونکہ اِس صورتِ حال میں وہی صاحبِ اختیار ہے۔

دفعہ نمبر 4: مجلسِ امت کے اختیارات کے ضمن میں چوتھی دفعہ کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بحرین کے عامل علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا تھا، کیونکہ عبدقیس کے وفد نے رسول اللہ ﷺ سے ان کی شکایت کی تھی۔ ابن سعد محمد بن عمر کی روایت نقل کرتے ہیں:

(أن رسول اللّٰه ﷺ قد كتب إلى العلاء بن الحضرمي أن يقدم عليه بعشرين رجلاً من عبد قيس، فقدم عليه بعشرين رجلاً رأسهم عبداللّٰه بن عوف الأشجّ، واستخلف العلاء على البحرين المنذر بن ساوى،فشكا الوفد العلاء بن الحضرمي، فعزله رسول اللّٰه ﷺ وولّى أبان بن سعيد بن العاص، وقال له استوص بعبد القيس خيراً، وأكرم سراتهم)

''رسول اللہ ﷺ نے علاء بن حضرمی کو لکھا کہ وہ عبدقیس کے بیس افراد کے ساتھ آئیں، علاء اپنے پیچھے منذر بن ساوی کو اپنا نائب مقرر کر کے اور بیس آدمیوں کو عبداللہ بن عوف الاشج کی قیادت میں لے کر رسول کے سامنے حاضر ہوا۔ وفد نے علاء کی شکایت کی، رسول اللہ ﷺ نے اُنہیں معزول کر دیا اور ابان بن سعید بن العاص کو اُن کی جگہ بحرین کا والی مقرر کیا اور اُنہیں عبدقیس سے اچھا برتاؤ کرنے اور اُس کے سرداروں کا احترام کرنے کی نصیحت فرمائی''

اسی طرح عمر رضی اللہ عنہ نے بھی سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو ولایہ کی حاکمیت سے محض شکایت کی

بنیاد پر معزول فرمایا اور کہا: ''أنی لم أعزله عن عجز ولا عن خیانة''، ''میں نے اُنہیں اُن کی کسی کمزوری یا خیانت کے سبب معزول نہیں کیا ہے''۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ولایہ کے عوام کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے امراء یا والیوں سے کسی بات پر ناراض ہوں اور اپنی ناراضی کا اظہار کریں اور خلیفہ اس بات کا پابند ہے کہ اُنہیں معزول کر دے۔ اسی طرح مجلسِ امت جو کہ تمام ولایات میں مسلمانوں کی نمائندہ ہوتی ہے اُسے یہ حق ہے کہ وہ والیوں اور عمال سے اپنی ناراضی کا اظہار کرے، اور مجلسِ ولایہ یا مجلسِ امت کی اکثریت کی شکایت پر خلیفہ اُنہیں فوراً برخواست کر دے۔ پھر اگر مجلس ولایہ اور مجلس امت کی رائے میں اختلاف واقع ہو، تو مجلسِ ولایہ کی رائے کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ وہ مجلسِ امت سے زیادہ والی کے احوال پر علم ونظر رکھتی ہے۔

دفعہ نمبر 5: اس میں دو صورتیں شامل ہیں:

پہلی صورت یہ کہ خلافت کیلئے امیدواروں کی فہرست مرتب کرنا، اور دوسری صورت یہ کہ اس فہرست کی تعداد کو پہلے چھ اور پھر دو تک محدود کرنا۔

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے تو خلفائے راشدین ﷺ کے انتخاب کو دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے نمائندگان نے یا تو براہِ راست امیدواروں کی شارٹ لسٹنگ کی تھی، یا پھر خلیفہ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ امت کی طرف سے خود ہی امیدوار متعین کر دیں۔

لہٰذا سقیفہ بنی ساعدہ میں ایسا ہوا کہ وہاں ابوبکر، عمر، ابوعبیدہ اور سعد بن عبادہ ﷺ خلافت کے امیدوار یا نامزد کنندگان تھے اور اِن کے سوا کوئی اور خلافت کا امیدوار نہیں تھا، یعنی خلافت کے نامزدگان کی فہرست اِنھیں حضرات تک محدود تھی۔ اس فہرست پر بنو ساعدہ کے اصحاب متفق تھے اور بعد ازآں صحابہ کرام کے اتفاق سے ابوبکرؓ کی بیعت ہوگئی۔

ابوبکر ﷺ کی خلافت کے آخری دور میں ابوبکر ﷺ نے مسلمانوں سے قریباً تین ماہ تک مشورے کئے کہ ان کے بعد کون خلیفہ ہو۔ اس مشورے کے بعد مسلمان ابوبکر ﷺ کی جانب سے

عمرؓ کی نامزدگی پر متفق ہو گئے، یعنی اس میں نامزد امیدواروں کی تعداد صرف ایک رہی۔

خلافت کے امیدواروں کی فہرست کی شارٹ لسٹنگ سب سے واضح عمرؓ کے زخمی کئے جانے کے بعد ہوئی، جب صحابہ کرامؓ نے اُن سے مطالبہ کیا کہ وہ کسی کو نامزد کریں تو عمرؓ نے چھ افراد کو نامزد فرمایا اور جیسا کہ معلوم ہے اُنہوں نے اس کی شدت سے تاکید کی۔

علیؓ کی نامزدگی کے وقت آپؓ تنہا امیدوار تھے اور دیگر کوئی امیدوار نہ تھا، لہٰذا اس قسم کی کوئی فہرست نہیں تھی۔

خلافت کے نامزدگان کی تعداد کو اس طرح تمام مسلمانوں کے سامنے محدود کیا جاتا تھا، اور چونکہ ایسا کرنے سے دیگر افراد کو اپنی امیدواری سے روک دیا جاتا ہے، لہٰذا اگر یہ عمل ناجائز ہوتا تو صحابہ کرامؓ اس کی مخالفت کرتے اور یہ نافذ نہ ہو پاتا۔ چنانچہ خلافت کیلئے امیدواروں یا نامزدگان کی تعداد کا اس طرح محدود کر دیا جانا صحابہ کرامؓ کے اجماع کی بناء پر جائز ہے۔ لہٰذا امت یا اُس کے نمائندوں کو یہ اختیار ہے کہ وہ خلافت کیلئے امیدواروں کی تعداد کو محدود کر دیں، خواہ یہ کام امت براہِ راست کرے یا امت کی جانب سے سابق خلیفہ ایسا کرے۔

اب جہاں تک اس محدود تعداد کو شروع میں چھ رکھنے کی بات ہے تو یہ عمرؓ کے فعل کے مطابق ہے اور اگلے مرحلہ میں اس تعداد کو مزید کم کر کے دو کرنا عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے عمل کے مطابق ہے۔ مزید برآں یہ کہ اس سے مسلمان رائے دہندگان کی اکثریتی رائے بامعنی ہو جائے گی کیونکہ اگر نامزدگان کی تعداد دو سے زیادہ ہو تو کامیاب امیدوار وہ ہوگا جس کو مثلاً ایک تہائی یا تیس فیصد سے زیادہ ووٹ حاصل ہوں، جو کہ حقیقی اکثریت یعنی پچاس فیصد سے کم ہے۔ اس کے برعکس اگر امیدواروں کی تعداد دو تک ہی ہو تو کامیاب امیدوار حقیقی اکثریت حاصل کر پاتا ہے۔

مجلسِ اُمت کی طرف سے نامزدگان کی تعداد کو پہلے چھ اور پھر دو تک محدود کرنا، محکمۂ مظالم کی جانب سے امیدواروں میں شروطِ انعقاد موجود ہونے کی تصدیق کے بعد ہوگا، تاکہ

امیدواروں میں خلافت کی شروطِ انعقاد کے موجود ہونے کو یقینی بنایا جا سکے۔ لہٰذا محکمہ مظالم ایسے تمام افراد کو اس فہرست سے خارج کر دیتا ہے جو انعقادی شرائط پر پورے نہ اترتے ہوں۔ اس کے بعد مجلسِ اُمت امیدواروں کی فہرست تیار کرے گی۔

اظہارِ رائے اور گفتار کا حق:

مجلس امت کے ہر رکن کو بغیر کسی دباؤ کے اپنی بات کہنے اور اپنی رائے کا اظہار کرنے کا حق ہوتا ہے، ان حدود و قیود کی پابندی کرتے ہوئے جو شرع نے مقرر کی ہیں۔ ایک رکن رائے کو پیش کرنے اور محاسبہ کرنے میں مسلمانوں کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کا کام ہے کہ وہ خلیفہ یا ریاست کے کسی بھی حاکم یا ریاست کے کسی بھی ادارے کے ملازم کے کاموں پر باریکی سے نگاہ رکھے اور اُن کا محاسبہ کرے اور انہیں صحیح مشورہ دے، تجاویز پیش کرے اور اُن پر گفت وشنید کرے، حکمرانوں کے وہ کام جو غلط ہوں اُن پر اعتراضات کرے۔ وہ یہ عمل مسلمانوں کی نیابت کے طور پر سرانجام دیتا ہے، جنہیں اللہ نے یہ حکم دیا ہے کہ وہ اچھائی کا حکم دیں، برائی سے روکیں، حکمرانوں کا محاسبہ کریں اور اپنی رائے اور تجاویز اُنہیں دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ المُنْكَرِ﴾

''تم ایک بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے کھڑی کی گئی ہے، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے منع کرتے ہو'' (آلِ عمران: 110)

اور فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر زمین میں ہم انہیں اقتدار عطا کریں، تو وہ نماز قائم کریں گے، اور زکوۃ دیں گے اور معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے'' (حج: 41)

اور فرمایا:

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾

''اورتم میں ایک ایسی جماعت ضرور ہونی چاہئے جو خیر کی طرف بلائے اور نیکی کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے'' (آل عمران: 104)

نیز متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر دلالت کرتی ہیں، مثلاً رسول اللہ ﷺ کا یہ قول جسے امام احمد نے حذیفہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے:

((والذي نفسي بيده، لتامرنَّ بالمعروف، ولتنهون عن المنكر، أو ليوشكنَّ الله أن يبعث عليكم عقاباً من عنده، ثم لتدعنه فلا يستجيب لكم))

''اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تم ضرور بالضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہو، ورنہ خطرہ ہے کہ اللہ تم پر اپنی طرف سے عذاب نازل کر دے پھر تم اسے پکار ولیکن وہ تمہاری دعا قبول نہ کرے''

اور یہ قول جسے مسلم نے ابوسعید رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے:

((من رأى منكم منكراً فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه و ذلك أضعف الإيمان))

''تم میں جو کوئی منکر دیکھے، وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے، اور اگر ہاتھ سے نہ بدل سکے تو زبان سے بدل دے اور اگر زبان سے بھی نہ بدل سکے تو دل سے برا جانے، اور یہ ایمان کا سب سے کم درجہ ہے''

ان آیات اور احادیث میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ نیکی کا حکم دیں اور منکر سے منع کریں، بلکہ حکام کے محاسبہ کیلئے خاص طور سے احادیث وارد ہوئی ہیں جن سے حاکم کے محاسبے، حاکم کو معروف کا حکم دینے اور اسے برائی سے روکنے کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ اُم عطیہ سے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((...أفضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر))

''... ظالم حکمران کے سامنے حق بات کہنا افضل جہاد ہے''

یہ نص حکام کے محاسبے اور اُن کے سامنے حق بات کہنے کو واجب قرار دیتی ہے، اور اس عمل کو جہاد بلکہ افضل جہاد ٹھہراتی ہے۔ اس عمل کی طرف شدت سے ترغیب دلائی گئی ہے اور ابھارا گیا ہے، خواہ اس کے نتیجے میں اس شخص کو قتل کر دیا جائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے صحیح حدیث میں مروی ہے:

((سيد الشهداء حمزة بن عبد المطلب، ورجل قام إلى إمام جائر فأمره و نهاه فقتله))

''شہداء کے سردار حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ ہیں اور وہ شخص بھی، جو ایک ظالم حکمران کے سامنے کھڑا ہوا اور اُسے نیکی کا حکم دیا اور برائی سے روکا اور اسے قتل کر دیا گیا''

اور جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے صلح حدیبیہ کے وقت رسول اللہ ﷺ کی سخت مخالفت کی تو آپ ﷺ نے اِس پر اُن کی سرزنش نہیں فرمائی محض اُن کی رائے کو مسترد کیا اور صلح نامہ پر دستخط فرما دیے کیونکہ آپ ﷺ کا فعل وحی سے تھا جس میں افراد کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ آپ ﷺ نے ان کی سرزنش اس بات پر فرمائی تھی کہ صحابہ نے قربانی کے جانوروں کو ذبح کرنے، اپنے سروں کو منڈھوانے اور احرام اُتار دینے میں آپ ﷺ کی اطاعت نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ حباب بن منذر رضی اللہ عنہ نے بدر کے موقع پر اُس جگہ پر اعتراض کیا تھا جو آپ ﷺ نے لشکر کے پڑاؤ کے لیے پسند کی تھی، تو تب بھی آپ ﷺ نے اُن کی سرزنش نہیں فرمائی تھی بلکہ اُن کی رائے کو تسلیم کیا تھا۔

غزوۂ اُحد کے وقت بھی رسول اللہ ﷺ نے اکثریت کی رائے کو تسلیم کرتے ہوئے قریش سے جنگ کیلئے مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کا فیصلہ کیا، جبکہ آپ ﷺ کی اپنی رائے اس کے برخلاف تھی۔ رسول اللہ ﷺ لوگوں کے اعتراضات کو سنا کرتے تھے اور ان کا جواب دیا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی صحابہ کرام ؓ بھی خلفائے راشدین ؓ کا محاسبہ کرتے رہے تھے اوراس پر خلفائے راشدین ؓ نے کبھی صحابہ کرام ؓ کو نہیں روکا۔ صحابہ کرام ؓ نے یمن سے آنے والی چادروں کی تقسیم پر عمر ؓ کا محاسبہ کیا تھا جب وہ ممبر پر تھے۔ اسی طرح ایک عورت نے مہر زیادہ مقرر کرنے سے منع کرنے پر عمرؓ پر اعتراض کیا تھا۔ عراق فتح ہونے کے بعد وہاں کی زمین مسلم فوج میں تقسیم کرنے سے انکار پر بھی آپؓ کا محاسبہ کیا گیا اور آپؓ کے اس عمل پر اعتراض کیا گیا، جس میں بلال ؓ اور زبیر ؓ آپؓ کے ساتھ کافی شدید بھی ہوئے تھے۔ عمر ؓ صحابہ کرام ؓ سے بحث ومشورہ کرتے رہے یہاں تک کہ آپؓ نے انہیں اپنی رائے پر مطمئن کر دیا۔

لہٰذا مجلس امت کے ہر رکن کو مسلمانوں کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے یہ حق ہے کہ وہ مجلس میں جیسے چاہے اپنی بات رکھے، بغیر کسی کے روکے، بغیر کسی قسم کے دباؤ کے، اور اسے یہ حق ہے کہ وہ خلیفہ، معاونین، والیوں اور ریاست کے کسی بھی ملازم کا محاسبہ کرے اور اُن لوگوں پر یہ لازم ہے کہ وہ اُس کا جواب دیں جب تک کہ وہ رکن اپنی رائے رکھنے اور اُن کے محاسبہ کرنے میں احکامِ شرع کی پابندی کرے۔

نیز مجلس امت کے غیر مسلم اراکین کو بھی یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ حکام کے ظلم کے بابت اپنی رائے کو بلا روک ٹوک پیش کریں، بشرطیکہ یہ عمل شرعی احکام کے دائرے میں ہو۔

پرچم اور جھنڈے

رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ منورہ میں پہلی اسلامی ریاست قائم کی تو اُس کے مخصوص پرچم اور جھنڈے تھے، اسی کی پیروی میں ریاستِ خلافت کے پرچم اور جھنڈے ہوں گے اور اُن کی طرز حسبِ ذیل ہوگی:

لغت کے لحاظ سے پرچم اور جھنڈے (عَلَم) کہلاتے ہیں قاموس المحیط میں لفظ: رَوِیَ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے: (...والراية العلم ج رايات) "رَايَة عَلَم ہے اور اس کی جمع رایات ہے"۔ اور لفظ: لَوِی کے بارے میں ہے: (...واللواء بالمد العلم ج الوية) "لواء عَلَم ہوتا ہے اور لواء کی جمع اَلْوِيَة ہے۔

شریعت میں اِن کے استعمال کے اعتبار سے اِن کے معنی حسبِ ذیل ہیں:

۞ لِوَاء سفید رنگ کا ہوتا ہے جس پر سیاہ رنگ سے کلمہ (لا إله إلا الله محمد رسول الله) تحریر ہوتا ہے۔ یہ پرچم فوج کے امیر یا قائد کے سپرد ہوتا ہے اور اُس کے جائے قیام کی علامت ہوتا ہے، نیز وہ جہاں قیام کرتا ہے یہ پرچم اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے فوج کے امیر کے سپرد ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ فتح مکہ کے وقت مکہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ کا لـــــواء سفید تھا، یہ حدیث ابنِ ماجہ نے جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ اسی طرح نسائی نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

(أنَّــه حين أمــر أسامة بن زيــد على الجيش ليغــزو الروم عقد لواءه بيــده)

''جب رسول اللہ ﷺ نے اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کوروم سے جنگ کیلئے امیر مقرر فرمایا تواپنے ہاتھ سے ان کے لیے اپنالِوَاء باندھا''

۞ رَایَات سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں جن پر سفید رنگ سے **لا إلـه إلا الـلّٰـه محمد رسول اللّٰه** کلمہ تحریر ہوتا ہے۔ ایسے پرچم فوج کی ایک ٹکڑی مثلاً رجیمنٹ (Regiment) یا کسی مہم کے امیر کے سپرد ہوتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ معرکہ خیبر میں جہاں رسول اللہ ﷺ بذاتِ خود فوج کے قائدِ اعلیٰ تھے، آپ ﷺ نے فرمایا تھا:

((لأعطيّن الراية غداً رجلاً يحب اللّٰه و رسوله، و يحبه اللّٰه و رسوله، فأعطاها علياً))

''کل میں رایہ ایک شخص کو دونگا، اس سے اللہ اور اس کا رسول ﷺ محبت رکھتے ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے؛ پھر آپ نے رایہ علی رضی اللہ عنہ کو عطا کیا''

لہٰذا علی رضی اللہ عنہ فوج کے ایک دستہ یا رجیمنٹ کے قائد کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی طرح حارث بن حسان البکری سے احمد اور ابنِ ماجہ نے روایت کیا ہے:

((قدمنا المدينة فإذا رسول اللّٰــه ﷺ على المنبـر، و بـلال قائم بين يديه متقلد السيف بين يدي الرسول ﷺ، و إذا رايات سُودٌ، فسألت: ما هذه الريات؟ فقالوا: عمرو بن العاص قَدِمَ من الغَزاة))

''جب ہم مدینہ پہنچے تو رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے اور بلال آپ ﷺ کی تلوار لئے آپ ﷺ کے سامنے کھڑے تھے، اور سیاہ رَایَات بھی تھے، میں نے دریافت کیا کہ یہ کیسے رایات ہیں تو لوگوں نے بتایا کہ عمرو بن العاص لڑائی سے لوٹے ہیں''

اس روایت میں **(فإذا رايات سود)** یعنی متعدد سیاہ پرچم تھے؛ کے معنی یہ ہوئے کہ گو کہ فوج کے قائد ایک ہی تھے، یعنی عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، لیکن پرچموں کی تعداد فوج کے مختلف دستوں

یا ریجیمنٹ کے لحاظ سے تھی۔

لہٰذا لواء فوج کے قائد کو باندھا جاتا ہے، جبکہ رایات، فوج کے دستوں اور رجیمنٹ کے امیروں کے سپرد ہوتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر کسی بھی فوج میں لـــواء تو ایک ہی ہوتا ہے جبکہ رایات متعدد ہوتے ہیں۔

اس طرح لـــواء فوج کے امیر ہی کے پاس، جبکہ رایات دیگر فوجیوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

لواء فوج کے امیر کے باندھا جاتا ہے اور اس کے جائے قیام کی علامت ہوتی ہے، یعنی یہ امیر کی جائے قیام سے منسلک ہوتا ہے۔ معرکہ کے دوران معرکے کے قائد کے پاس، خواہ وہ فوج کا امیر بذاتِ خود ہو یا اُس کا مقرر کردہ کوئی افسر ہو، رایہ ہوتا ہے اور اسے **اُم الْحَرب** کہا جاتا ہے کیونکہ یہ میدانِ جنگ میں معرکہ کے امیر کے ساتھ ہوتا ہے۔

لہٰذا جنگ کے دوران فوج کے ہر کمانڈر کے پاس رایہ ہوتا ہے۔ یہ بات اُس زمانے میں معروفِ عام تھی۔ اس رایہ کا لہراتے رہنا اس فوج کی طاقت کی علامت ہوتی تھی۔ یہ ایک انتظامی معاملہ ہے اور اسے جنگ کے معروف طریقہ کے مطابق اختیار کیا جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے زید، جعفر اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کی خبر سناتے ہوئے کہا، جبکہ ابھی تک آپ ﷺ کے پاس سپاہی یہ خبر لے کر نہیں آئے تھے:

((أخذ الراية زيد فأصيب، ثم أخذها جعفر فأصيب، ثم أخذها ابن رواحة فأصيب))

''زید رضی اللہ عنہ نے رایہ لیا اور وہ شہید ہو گئے، پھر جعفر رضی اللہ عنہ نے رایہ اٹھایا اور وہ بھی شہید ہو گئے، پھر ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے رایہ اٹھایا اور وہ بھی شہید ہو گئے''

نیز اگر کسی جنگ کے دوران میدان جنگ میں خلیفہ بذاتِ خود موجود ہو تو رایہ کے ساتھ

ساتھ لواء کا لہرانا بھی درست ہے۔ سیرۃ ابن ہشام میں وارد ہے کہ غزوہ بدر کے موقع پر لواء اور رایہ دونوں موجود تھے۔

اس کے برعکس حالت امن میں یا معرکہ ختم ہوجانے کے بعد یہ پرچم فوج میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، اورانھیں فوج کی ڈویژن (divisions)، رجیمنٹ (Regiments)، اورٹکڑیاں (battalions) وغیرہ اُٹھائے ہوئے ہوتی ہیں، جیسا کہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی فوج کے بارے میں حارث ابن حسان البکری کی روایت میں گزرا۔

۞ اسلام میں فوجوں کا قائد خلیفہ ہوتا ہے لہٰذا شرعاً لـــــــواء اُس کے جائے قیام یا دارالخلافہ (Capital) پر ہوگا کیونکہ لواء بہرحال فوج کے امیر کے پاس ہوتا ہے۔ نیز اس پرچم کو دار الخلافہ کے مکتبِ انتظامی (خلیفہ کے دفتر) پر بھی لہرایا جاسکتا ہے کیونکہ خلیفہ ہی دراصل تمام ریاستی ڈھانچوں کا سربراہ ہوتا ہے۔

ریاست کے باقی اداروں کے دفاتر پر رایہ ہی لہرایا جاسکتا ہے نہ کہ لـــواء کیونکہ یہ فوج کے قائد کیلئے مخصوص ہوتا ہے اور اُس کے جائے قیام کی علامت ہوتا ہے۔

۞ لواء کو نیزے کے سرے پر باندھ کر فوج کے قائدین کو اُن کے تعداد کے مطابق سونپا جاتا ہے؛ مثلاً پہلی، دوسری اور تیسری فوج کے قائدین کو یا قائد دستۂ فلسطین، قائد دستۂ شام یا قائد دستۂ عراق یا قائد دستۂ حلب، قائد دستۂ حمص یا قائد دستۂ بیروت کو، اُن کے جس طرز پر نام رکھے گئے ہوں، سونپا جاتا ہے۔

بنیادی طور پر لواء نیزے کے گرد لپٹا رہتا ہے اور اسے ضرورت کے مطابق ہی لہرایا جاتا ہے؛ مثال کے طور پر دار الخلافہ پر جس سے وہاں کی اہمیت عیاں ہو یا حالتِ امن میں عسکری قیادت کی عمارت پر جس سے امت اپنی افواج کے پرچم کی عظمت کا مشاہدہ کرے۔ البتہ اگر پرچم کا یوں لہرایا جانا امن کی احتیاطات کے اعتبار سے خطرے کا باعث ہو، جیسے یہ خطرہ لاحق ہو کہ دشمن

پرچم سے فوجی ٹھکانے کے وقوعہ معلوم کرلیں گے تو پرچم کولہرانے کے بجائے اُس کی اصل حالت میں ہی رہنے دیا جائے یعنی نیزے کے سرے پر لپیٹ کر رکھا جائے۔

اس کے برعکس رایہ کو ہوا میں لہرایا جاتا ہے اور ریاست کے مختلف محکموں پر نصب کیا جاتا ہے۔

خلاصہ:

1) فوجی لحاظ سے:

۞ جنگ کے دوران لواء فوج کے امیر کے مقام پر نصب ہوگا۔ اس کی اصل شکل یہ ہے کہ اسے نیزے پر لپیٹ کر رکھا جائے اور امن کی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد ہی اسے نمایاں کیا جائے۔

میدانِ جنگ میں معرکہ کا امیر رایہ لئے ہوئے ہو اور اگر خلیفہ بذاتِ خود میدان جنگ میں موجود ہو تو لواء بھی ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔

۞ حالتِ امن میں لواء فوجی قیادت کو سونپا جاتا ہے اور اسے نیزے سے لپٹا ہوا رکھا جاتا ہے یا اسے عسکری قیادت کی عمارت پر لہرایا جاسکتا ہے۔

رایات فوج کے دستوں، رجیمنٹ، بٹالین یا دیگر وحدات میں تقسیم ہوتے ہیں۔ اِن میں ہر بٹالین یا رجیمنٹ کا مخصوص رایہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور یہ ایک انتظامی معاملہ ہوتا ہے۔

2) ریاست کے تمام محکمات اور اداروں پر نیز سیکیورٹی اداروں پر صرف رایہ ہی نصب کیا جائے، ماسوائے دارالخلافہ پر، جہاں خلیفہ کے عسکری قائداعلیٰ ہونے کے لحاظ سے لواء نصب ہوگا۔ اس لواء کے ساتھ رایہ بھی نصب کیا جاسکتا ہے کیونکہ خلیفہ ریاستی اداروں اور ڈھانچوں کا سربراہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ نجی ادارے اور عام لوگ بھی رایہ رکھ سکتے ہیں اور اپنے اداروں اور گھروں پر نصب کرسکتے ہیں، خاص طور مخصوص موقعوں پر، جیسے عیدین یا فتح حاصل ہونے پر وغیرہ۔

ریاستِ خلافت کا ترانہ

ایک ریاست کو دیگر سیاستوں سے امتیازی حیثیت دینے یا ایک گروہ کی دوسرے سے جداگانہ پہچان کیلئے کسی شعار کو اختیار کیا جاتا ہے اور یہ ایک مباح معاملہ ہوتا ہے۔ سابقہ زمانہ میں مسلمانوں نے ایسے شعار اختیار کئے ہوئے تھے جنہیں وہ دشمن ریاست سے جنگ کے وقت فخریہ علامت کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے وقت اُن کی اجازت سے انھیں استعمال کیا گیا، مثلاً حـــم لا ینـصرون کو جنگِ خندق اور بنوقریظہ کے وقت بحیثیت شعار اختیار کیا گیا تھا، غزوۂ بنی مصطلق کے وقت یا منصور أمت أمت اختیار کیا گیا تھا وغیرہ۔

علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ نے فطرتاً انسان کی تخلیق میں اسے کچھ خصوصیات عطا فرمائی ہیں جیسے سننے، دیکھنے اور بولنے کی قوت وغیرہ، یہ سب مباح کے دائرے میں آتے ہیں۔ انسان جو چاہے دیکھ سکتا ہے، سن سکتا ہے اور اُسے بول کر ادا کر سکتا ہے ماسوائے کہ کسی شے کے متعلق کوئی مخصوص دلائل وارد ہوئے ہوں۔

لہٰذا اسلامی ریاست کیلئے فخریہ شعار اختیار کرنا جائز امر ہے، جو اسے دوسرے مما لک سے ممتاز حیثیت دیں اور اُن سے تعلقات میں انہیں استعمال کیا جائے۔ یہ دوسرے مما لک خلیفہ کے سفر میں یا دیگر مما لک کے رہنماؤں کی آمد پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ نیز عام افراد بھی اسے خاص تقاریب پر اپنی تنظیموں، مدرسوں اور نشریات وغیرہ میں استعمال کر سکتے ہیں۔

البتہ اس ہتاف یا ترانہ کی آواز کی اونچ نیچ، اسے ترنم سے پڑھنا یا بلا ترنم پڑھنا وغیرہ یہ تمام مباحات میں داخل ہے۔ سابقہ زمانے میں مسلمان ایسے ترانوں کو رجز یا 'وزن'

میں پُرتاثیر آواز میں پڑھا کرتے تھے، جو اُس تقریب کی مناسبت سے ہوتا، جہاں یہ ترانہ پڑھا جارہا ہو۔

ریاستِ خلافت کیلئے ترانہ کا ہونا تبنّی کیا گیا ہے جسے ضروری مقامات پر استعمال کیا جاسکے جہاں خلیفہ دیگر ممالک کے رہنماؤں سے رسمی (official) ملاقات کرے اور عوام بھی اسے اپنی مخصوص تقاریب میں استعمال کریں۔

اللہ کے اِذن سے ریاستِ خلافتِ الثانی کے ترانے میں مندرجہ ذیل اُمور کی رعایت رکھی گئی ہے:

۞ اس ترانے میں خلافتِ راشدہ کی دوبارہ واپسی اور رسول اللہ ﷺ کے پرچم **العقاب** کے دوبارہ بلند ہونے کی خوشخبری ہے۔

۞ اس ترانہ میں رسول اللہ ﷺ کی اس بشارت کا بھی ذکر ہوگا جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامِ خلافت کے بعد زمین اپنے خزانے اُگلے گی اور آسمان سے برکات نازل ہوں گی اور زمین سابقہ ظلم کے بعد عدل سے بھر جائے گی۔

۞ اس میں تمام دنیا کے فتح کئے جانے اور اُنہیں اسلامی ریاست کے خیمہ میں داخل کرنے کے بعد دنیا بھر میں خیر کو عام کرنے کا ذکر ہوگا۔ اس میں اِن تین مساجد کا بھی ذکر ہوگا جن کیلئے سفر کا سامان باندھا جاسکتا ہے یعنی، مسجدِ حرام، مسجدِ نبوی ﷺ اور مسجد اقصیٰ جسے یہودیوں کی ریاست کو جڑ سے نابود کر کے حاصل کیا جائے گا۔

۞ اس کے اختتامی حصہ میں امت کے ایسا بن جانے کا ذکر ہوگا جیسی اللہ تعالیٰ کی رضا ہے یعنی کہ یہ خیرالامت ہے جو لوگوں کی بھلائی کیلئے کھڑی کی گئی ہے، اس امت کا عظیم مقصد اللہ تعالیٰ کی رضاء کا حصول ہے، جس کے حاصل ہونے پر اس کی طرف سے عزت بخشی جائے گی، رحمت ہوگی اور جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات نصیب ہوں گے۔

۞ اس میں تکبیر دہرائی جائے گی، جس کا اسلام اور مسلمانوں کی زندگی میں خاص مقام و رتبہ

ہے، جو مسلمانوں کی عیدوں اور اُن کی فتح و کامرانی پر دہرائی جاتی ہے اور مسلمانوں کی زبانیں اہم موقعوں پر اسے بلند کرتی ہیں۔

مندرجہ بالا نکات کی روشنی میں ریاست کے ترانے کو اس کتاب کے ضمیمے میں بیان کیا جائے گا اور انشاءاللہ مناسب وقت پر اس کا اعلان کیا جائے گا۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ ربّ العالمین